جولائی ۲۰۲۶ء

DIRECTORATE OF ELECTRONIC MEDIA AND PUBLICATIONS

# پاک جمہوریت

وزارتِ اطلاعات ونشریات کا جریدہ

جلد: 66 شمارہ: 07

P Y O
GHIZER
گلگت بلتستان اسمبلی
GILGIT BALTISTAN
ASSEMBLY
GILGIT BALTISTAN ASSEMBLY
GILGIT-BALTISTAN
ELECTION

DIRECTORATE OF ELECTRONIC MEDIA AND PUBLICATIONS

جولائی ۲۰۲۶ء

# پاک جمہوریت

وزارتِ اطلاعات ونشریات کا جریدہ

جلد:66 شمارہ:07

| | | | |
|---|---|---|---|
| | اداریہ | | ۵ |
| ۱۔ | وزیراعظم شہباز شریف کے غیر ملکی دورے<br>سفارتی ضروریات یا معاشی بوجھ | کنول افتخار | ۶ |
| ۲۔ | بجٹ، آئی۔ایم۔ایف کا<br>یا خودمختار پالیسی سازی کا؟ | ناصر نقوی | ۱۳ |
| ۳۔ | گلگت بلتستان انتخابات 2026<br>مقامی خواہشات اور قومی سیاست کے درمیان | امتیاز احمد تارڑ | ۱۹ |
| ۴۔ | پاکستان کا آئینی مباحثہ<br>تنازعات اور کشیدگی | ڈاکٹر محمد گلزار | ۲۶ |
| ۵۔ | لاہور اور کراچی: ترقی، ترجیحات اور<br>شہری حکمرانی کی دو مختلف کہانیاں | محمد زکریا | ۳۲ |
| ۶۔ | مصنوعی ذہانت کی معیشت<br>چوتھا صنعتی انقلاب | رباب زہرا | ۴۰ |

نگران اعلیٰ: عمرانہ وزیر
نگران: محمد سلیم
مینجنگ ایڈیٹر: شبیہ عباس
ایڈیٹر: مائرہ جاوید
ڈیزائنر: محمد وسیم

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز،
291۔اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور
انتظامیہ: 042-99333909
مدیر: 042-99333912
email:editor@pakjamhuriat.org

# انتباہ

ادارے اور میگزین ''پاک جمہوریت'' کا مقصد عوام الناس کو آگاہ کرنا اور بہترین مواد مہیّا کرنا ہے۔ البتہ شمارے میں شامل تمام مضامین مصنفین کی ذاتی آراء پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا ادارے یا ادارے کے کسی فرد پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

# اداریہ

پاکستان کے داخلی مسائل، خارجی چیلنجز کے مقابلے میں زیادہ اہم ہیں۔ اگر داخلی استحکام حاصل ہو جائے تو بیرونی خطرات سے نمٹنا بھی آسان ہو سکتا ہے۔ قومی اسمبلی اور سینیٹ میں اٹھارویں آئینی ترمیم پر جاری بحث کے نتائج اور اس کے اثرات پر سب کی نظریں مرکوز ہیں۔ مالی سال 27–2026 کا وفاقی بجٹ پیش ہو چکا ہے، تاہم یہ سوال برقرار ہے کہ آیا یہ آئی ایم ایف کی شرائط پر مبنی ہے یا عوام کو حقیقی ریلیف فراہم کرے گا۔ اس کا اندازہ آنے والے مہینوں میں ہوگا۔ وزیر اعظم کے غیر ملکی دوروں پر تنقید نئی نہیں بلکہ ہر دورِ حکومت میں یہ موضوع زیرِ بحث رہا ہے۔ گلگت بلتستان کے انتخابات بھی اہم رہے۔ پاکستان کے اس خوبصورت سیاحتی خطے کی ترقی نہ صرف مقامی عوام بلکہ ملکی سیاحت کے فروغ کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ کراچی اور لاہور کی ترقی اور خوبصورتی پر جاری بحث سیاسی اور سماجی دونوں پہلو رکھتی ہے۔ امید ہے کہ یہ مثبت مقابلے کو فروغ دے گی، نہ کہ اختلافات کو۔ مصنوعی ذہانت (اے آئی) اب مستقبل نہیں بلکہ موجودہ حقیقت ہے، جو مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کے ساتھ دنیا کو تیزی سے تبدیل کر رہی ہے۔

شکریہ

ایڈیٹر پاک جمہوریت

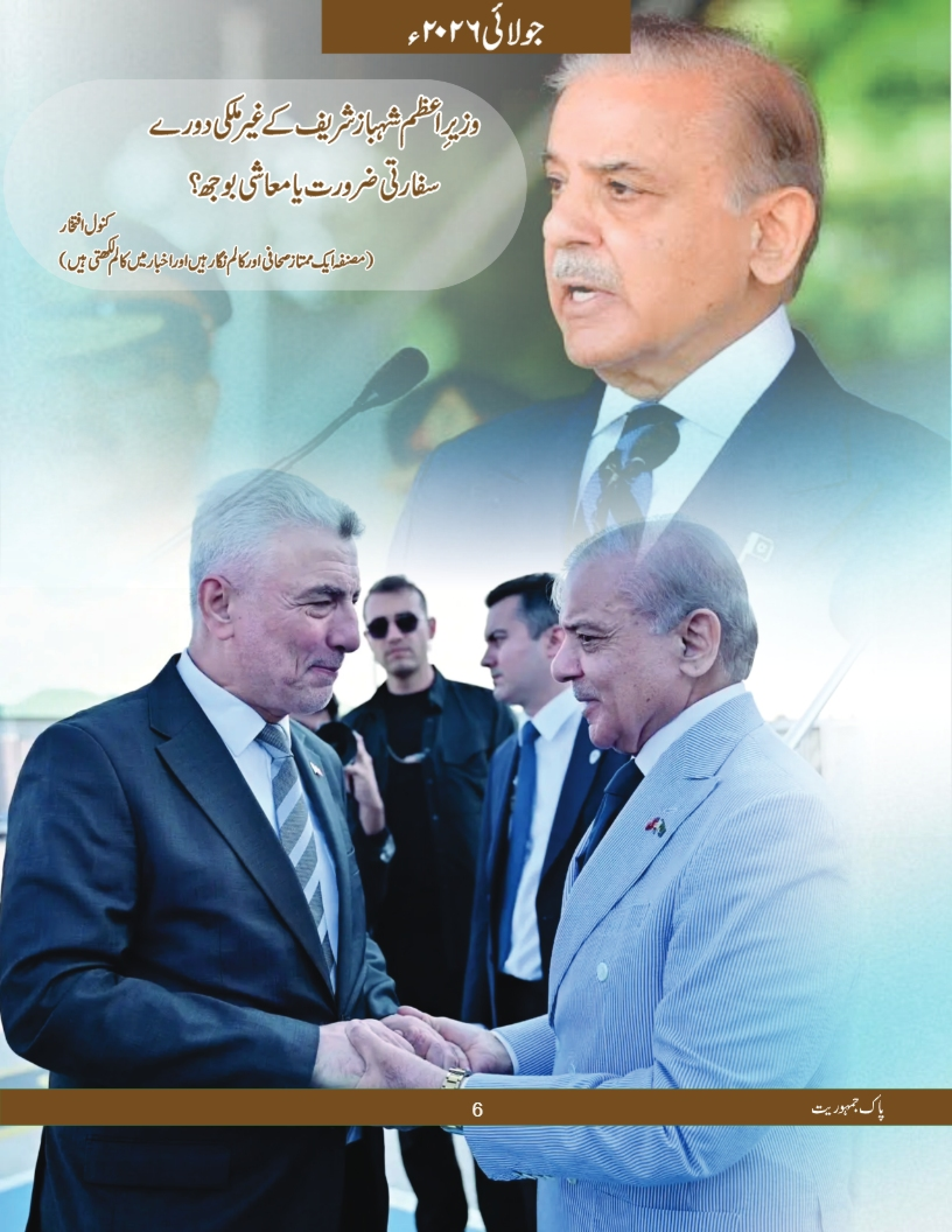

# وزیرِ اعظم شہباز شریف کے غیر ملکی دورے
# سفارتی ضرورت یا معاشی بوجھ؟

کنول افتخار
(مصنفہ ایک ممتاز صحافی اور کالم نگار ہیں اور اخبار میں کالم لکھتی ہیں)

پاکستان کی خارجہ پالیسی ہمیشہ سے ایک نازک موڑ پر کھڑی رہی ہے۔ ایک طرف عالمی طاقتوں کے ساتھ تعلقات کو برقرار رکھنے اور نئے اقتصادی مواقع تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف اندرونی معاشی بحران، قرضوں کا بوجھ اور عوامی سطح پر بڑھتی ہوئی مہنگائی وہ حقائق ہیں، جو ہر سرکاری دورے کو عوامی تنقید کے کٹہرے میں لے آتے ہیں۔

وزیرِاعظم شہباز شریف کے غیر ملکی دورے بھی اسی تناظر میں ایک مستقل بحث کا حصہ بن چکے ہیں: کیا یہ دورے واقعی پاکستان کے لیے معاشی اور سفارتی فائدہ پیدا کر رہے ہیں یا یہ صرف ایک مہنگا سفارتی پروٹوکول بن چکے ہیں جس کا بوجھ بالآخر قومی خزانے پر پڑتا ہے؟ اس سوال کا سیدھا جواب دینا آسان نہیں، کیونکہ ریاستی خارجہ پالیسی جذبات یا فوری نتائج کے بجائے طویل المدتی مفادات پر چلتی ہے۔ کسی بھی وزیرِاعظم کے غیر ملکی دورے محض رسمی ملاقاتوں کا سلسلہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے پیچھے سرمایہ کاری، تجارتی معاہدے، دفاعی تعاون اور بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے کے پیچیدہ اہداف ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ایک ایسے ملک کے لیے جو مسلسل آئی ایم ایف پروگرامز، مالی خسارے اور زرمبادلہ کے دباؤ کا شکار ہو، وہاں بین الاقوامی سطح پر روابط قائم رکھنا ایک مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی۔ تاہم مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب ان دوروں کے نتائج اور ان پر اٹھنے والے اخراجات کے درمیان واضح توازن نظر نہیں آتا۔

عوامی سطح پر یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ کتنے دوروں کے نتیجے میں حقیقی سرمایہ کاری پاکستان آئی، کتنے معاہدے عملی شکل اختیار کر سکے اور کتنی معاشی بہتری براہ راست ان سفارتی سرگرمیوں سے جڑی ہے۔ اگر جواب غیر واضح ہو تو پھر ان دوروں کو محض ایک مہنگی مشق سمجھا جانے لگتا

ہے۔شہباز شریف کی حکومت نے خاص طور پر معاشی سفارت کاری (Economic Diplomacy) کو اپنی پالیسی کا مرکزی نکتہ بنایا ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ روایتی سیاسی تعلقات سے آگے بڑھ کر سرمایہ کاری، توانائی، انفراسٹرکچر اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں براہِ راست تعاون حاصل کیا جائے۔چین، خلیجی ممالک، ترکی اور مغربی دنیا کے ساتھ روابط اسی حکمتِ عملی کا حصہ ہیں۔لیکن یہاں اصل چیلنج یہ ہے کہ پاکستان کی اندرونی معاشی ساخت وہ بنیاد فراہم نہیں کرتی جس پر بڑے اور پائیدار سرمایہ کاری کے منصوبے فوری طور پر کھڑے کیے جاسکیں۔

دوسری طرف یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ عالمی سیاست میں تنہائی کسی بھی کمزور معیشت کے لیے مزید نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔اگر پاکستان بین الاقوامی فورمز پر فعال کردار ادا نہ کرے تو نہ صرف سرمایہ کاری کے مواقع کم ہو جاتے ہیں بلکہ سیاسی حمایت بھی متاثر ہوتی ہے، جو خاص طور پر مالیاتی اداروں اور قرض دہندگان کے ساتھ مذاکرات میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔اس لیے ان دوروں کو مکمل طور پر غیر ضروری یا فضول قرار دینا بھی ایک سطحی تجزیہ ہوگا۔اصل مسئلہ شفافیت اور نتائج کے پیمانے کا ہے۔جب کسی دورے کے بعد حکومتی سطح پر بڑے بڑے معاہدوں کا اعلان تو کیا جاتا ہے لیکن ان کی تفصیلات، ٹائم لائن اور عملی پیش رفت واضح نہیں ہوتی تو عوامی شکوک بڑھ جاتے ہیں۔اسی طرح جب دوروں کے اخراجات، وفود کا حجم اور پروٹوکول کی تفصیل سامنے نہیں آتی تو تاثر یہ بنتا ہے کہ ریاستی وسائل کا استعمال غیر متوازن ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں خارجہ پالیسی اکثر ردِعمل (Reactive) بنیادوں پر چلتی ہے۔یعنی عالمی حالات کے مطابق فوری دورے اور ملاقاتیں تو ہوتی ہیں، لیکن ایک مستقل اور طویل المدتی حکمت عملی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر حکومت اپنے دوروں کو نئی سمت دینے کا دعویٰ کرتی ہے مگر بنیادی ڈھانچہ وہی رہتا ہے۔اگر اس پورے معاملے کو غیر جذباتی انداز میں دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ غیر ملکی دورے بذاتِ خود نہ تو مکمل طور پر فائدہ مند ہوتے ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر بوجھ۔یہ ایک ایسا ٹول ہیں، جن کی افادیت اس بات پر منحصر ہے کہ انہیں کس حکمت عملی کے تحت استعمال کیا جارہا ہے۔مسئلہ استعمال کا ہے، وجود کا نہیں۔

اب اصل سوال یہ ہے کہ جب ان دوروں کو نتائج کے پیمانے پر پرکھا جائے تو تصویر کتنی مختلف نظر آتی ہے۔پاکستان کے حالیہ غیر ملکی روابط میں سب سے زیادہ زور اقتصادی تعاون پر رہا ہے۔خلیجی ممالک کے ساتھ سرمایہ کاری کے وعدے، چین کے ساتھ جاری اقتصادی راہداری کے منصوبے اور مغربی مالیاتی اداروں کے ساتھ قرض و اصلاحات کی بات چیت یہ سب اسی سفارتی سرگرمیوں کا حصہ ہیں۔لیکن ان میں سے زیادہ تر معاملات کا مسئلہ یہ نہیں کہ بات نہیں ہوتی، مسئلہ یہ ہے کہ بات سے عمل تک کا فاصلہ غیر معمولی طور پر لمبا ہے۔اکثر اعلانات میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری یا بڑے اقتصادی پیکجز کا ذکر سامنے آتا ہے، مگر جب چند ماہ گزرنے کے بعد زمینی صورتحال دیکھی جائے تو یا تو منصوبے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں یا پھر ان کی رفتار غیر واضح ہوتی ہے۔اس سے ایک مستقل تاثر بنتا ہے کہ سفارتی سطح پر "اعلان" زیادہ ہے اور "ڈیلیوری" کم۔یہاں ایک اہم نکتہ سمجھنا ضروری ہے: بین الاقوامی سرمایہ کاری فوری طور پر نہیں آتی۔کوئی بھی ملک صرف ملاقات یا معاہدے کی تصویر سے

اربوں ڈالر منتقل نہیں کرتا۔ سرمایہ کار سب سے پہلے سیاسی استحکام، پالیسی تسلسل، قانونی تحفظ اور مالی شفافیت دیکھتا ہے۔

پاکستان کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ حکومتیں بدلتی ہیں تو پالیسی کا رخ بھی بدل جاتا ہے، جس سے اعتماد کا بحران پیدا ہوتا ہے۔ شہباز شریف کے دور میں ایک کوشش یہ بھی رہی ہے کہ خلیجی ممالک کے ساتھ تعلقات کو سرمایہ کاری پارٹنرشپ میں بدلا جائے، خاص طور پر توانائی، بندرگاہوں اور رئیل اسٹیٹ کے شعبوں میں۔ مگر یہاں بھی رکاوٹ یہ ہے کہ پاکستان میں ادارہ جاتی فریم ورک اتنا مضبوط نہیں کہ بڑے غیر ملکی سرمایہ کار بغیر سیاسی رسک کے طویل المدتی سرمایہ کاری کر سکیں۔

دوسری طرف چین کے ساتھ تعلقات ایک مختلف ماڈل پیش کرتے ہیں۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری (CPEC) نے ایک وقت میں بڑے پیمانے پر امید پیدا کی تھی، لیکن اس کے دوسرے مرحلے میں سست روی اور قرضوں کے بوجھ نے اسے بھی ایک پیچیدہ منصوبہ بنا دیا ہے۔ غیر ملکی دوروں میں اس منصوبے کو بار بار دوبارہ متحرک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر عملی رفتار وہی سوال چھوڑ دیتی ہے جو برسوں سے موجود ہے: کیا یہ منصوبے واقعی معاشی تبدیلی لا رہے ہیں یا صرف انفراسٹرکچر تک محدود ہیں؟ اب اگر ان دوروں کے اخراجات کو دیکھا جائے تو مسئلہ صرف مالی نہیں بلکہ Perception کا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں بجٹ خسارہ، مہنگائی اور ٹیکس بوجھ مسلسل عوامی دباؤ پیدا کر رہے ہوں، وہاں ہر بیرونی دورہ علامتی طور پر بھی ایک سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے۔ وفود کا حجم، پروٹوکول اور سرکاری اخراجات عوامی بحث کا حصہ بن جاتے ہیں، چاہے ان کا مجموعی اثر ریاستی پالیسی میں معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستان میں اکثر اوقات خارجہ دوروں کی

کامیابی کو بیانئے کی سطح پر ماپا جاتا ہے، نہ کہ ڈیٹا اور نتائج کی بنیاد پر۔ حکومت کامیابی کو معاہدوں اور اعلانات میں دکھاتی ہے، جبکہ ناقدین اسے زمینی تبدیلی نہ آنے کی بنیاد پر رد کرتے ہیں۔ اس کشمکش میں اصل تصویر کہیں درمیان میں گم ہو جاتی ہے۔ ایک اور پہلو یہ ہے کہ عالمی سطح پر پاکستان کی حیثیت اب ایک "ہائی مینٹیننس پارٹنر" کی بن چکی ہے۔ یعنی ایسا ملک جس کے ساتھ تعلق رکھنا بھی ضروری ہے اور جس کے ساتھ معاملات بھی مسلسل نگرانی کے ساتھ چلانے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اعلیٰ سطحی دورہ صرف تعلقات بہتر بنانے کے لیے نہیں بلکہ اعتماد برقرار رکھنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غیر ملکی دورے ایک ایسے سفارتی آلے کے طور پر کام کر رہے ہیں جس کا اثر فوری طور پر نظر نہیں آتا، مگر جس کے بغیر پاکستان جیسے ملک کے لیے عالمی نظام میں فعال رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اصل سوال پھر وہی رہتا ہے: کیا یہ دورے ایک واضح معاشی حکمتِ عملی کا حصہ ہیں یا صرف بحرانوں کو Manage کرنے کا ایک مسلسل طریقہ؟

غیر ملکی دوروں پر بحث صرف معاشی یا سفارتی نہیں رہتی، یہ اندرونی سیاست کا حصہ بن چکی ہے۔ پاکستان جیسے سیاسی ماحول میں جہاں ہر بڑے فیصلے کو فوری طور پر مخالفانہ یا حمایتی بیانیے میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، وہاں وزیرِ اعظم کے بیرونی دورے بھی ایک سیاسی ہتھیار بن جاتے ہیں۔ حکومت انہیں "معاشی بحالی کی کوشش" کے طور پر پیش کرتی ہے، جبکہ اپوزیشن انہیں "قومی وسائل کا غیر ضروری استعمال" قرار دیتی ہے۔ اس کشمکش میں اصل پالیسی بحث پیچھے رہ جاتی ہے اور بیانیہ آگے نکل جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عوامی Perception اکثر اعداد و شمار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ جب مہنگائی بڑھ رہی ہو، روپے کی قدر دباؤ میں ہو اور روزمرہ اخراجات عام آدمی کے لیے مشکل بن رہے ہوں، تو کسی بھی اعلیٰ سطحی دورے کی تصویر عوامی سطح پر مثبت نہیں رہتی، چاہے اس کے پیچھے کتنی ہی بڑی سفارتی یا اقتصادی کوشش موجود ہو۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حکومت اور عوام کے درمیان توقعات کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ میڈیا اس پورے عمل میں ایک ڈبل رول ادا کرتا ہے۔ ایک طرف وہ حکومتی بیانات اور معاہدوں کو نمایاں کرتا ہے، دوسری طرف تنقیدی زاویے سے ان کے اثرات اور اخراجات پر سوال اٹھاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک ہی دورہ دو بالکل مختلف حقیقتوں میں تقسیم ہو جاتا ہے: ایک سرکاری بیانیہ اور ایک عوامی بیانیہ۔ اور ان دونوں کے درمیان حقیقت اکثر دھندلا جاتی ہے۔ اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو ہر ریاست اپنے سربراہان کے بیرونی دوروں کو ایک سرمایہ کاری سمجھتی ہے، نہ کہ صرف خرچ۔ لیکن فرق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سرمایہ کاری کا Return on Diplomacy واضح نہ ہو۔ پاکستان کے کیس میں یہی سوال بار بار سامنے آتا ہے کہ کتنے دورے ایسے تھے، جنہوں نے پالیسی سطح پر مستقل تبدیلی پیدا کی اور کتنے ایسے تھے جن کا اثر صرف وقتی Headlines تک محدود رہا۔ ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ پاکستان میں ادارہ جاتی Continuity کمزور ہے۔ ایک حکومت جس معاہدے یا پالیسی کو آگے بڑھاتی ہے، اگلی حکومت اکثر اسے یا تو بدل دیتی ہے یا اس کی رفتار کم کر دیتی ہے۔ اس سے نہ صرف غیر ملکی شراکت داروں کا اعتماد متاثر ہوتا ہے بلکہ وزیرِ اعظم کے دوروں کا اثر بھی محدود ہو جاتا ہے، کیونکہ بیرونی دنیا ریاست کے ساتھ نہیں بلکہ حکومت کے تسلسل کے ساتھ کام کرتی ہے۔ یہاں ایک گہرا

مسئلہ سامنے آتا ہے: پاکستان میں سفارت کاری اکثر شخصیت Personality Centred رہتی ہے، Institution-Centred نہیں۔ یعنی تعلقات افراد کے گرد گھومتے ہیں، نظام کے گرد نہیں۔ جب وزیرِ اعظم یا اعلیٰ قیادت بیرون ملک جاتی ہے تو فوری سطح پر دروازے کھلتے ہیں، مگر ان دروازوں کو مستقل اقتصادی راستوں میں بدلنے کے لیے مضبوط ادارہ جاتی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے، جو اکثر کمزور رہتی ہے۔ اسی وجہ سے غیر ملکی دوروں کا اثر ایک Economy Announcement تک محدود ہو جاتا ہے، جہاں کامیابی کا اظہار اعلانات، پریس کانفرنسز اور مفاہمتی یادداشتوں (MoUs) کی شکل میں ہوتا ہے، لیکن اصل امتحان Implementation کا ہوتا ہے، جو نسبتاً کمزور رہتا ہے۔ اس تمام بحث کے باوجود یہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عالمی نظام میں پاکستان کا انحصار مسلسل بڑھ رہا ہے۔ قرضوں کی ری فنانسنگ، توانائی کی درآمدات اور تجارتی خسارہ ایسے عوامل ہیں، جو ریاست کو مسلسل بیرونی روابط میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے غیر ملکی دورے مکمل طور پر اختیار نہیں بلکہ ایک مجبوری بھی ہیں۔ آخر میں اصل سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مسئلہ دوروں کا ہے یا اس نظام کا جس میں ان دوروں کے نتائج کو Measure کرنے کا کوئی واضح اور سخت معیار موجود نہیں؟ جب تک پالیسی سازی، معاہدوں کی شفافیت اور عملی نتائج کا ایک مستقل نظام نہیں بنتا، تب تک یہ بحث چلتی رہے گی کہ یہ دورے فائدہ ہیں یا بوجھ۔

اس پورے موضوع کو آخر میں ایک سیدھی حقیقت پر لا کر کھڑا کرنا ضروری ہے: مسئلہ نہ صرف غیر ملکی دوروں کا ہے اور نہ ہی صرف کسی ایک حکومت کا۔ اصل مسئلہ اس ریاستی ڈھانچے کا ہے جس میں خارجہ پالیسی کو ایک مربوط، مسلسل اور نتیجہ خیز نظام کے طور پر نہیں چلایا جاتا۔ پاکستان میں غیر ملکی دورے اکثر "کرائسس مینجمنٹ" کے تحت ہوتے ہیں، "اسٹریٹیجک پلاننگ" کے تحت نہیں۔ یعنی جب فوری مالی ضرورت، عالمی دباؤ یا کسی بڑے معاہدے کی ضرورت سامنے آتی ہے تو دورے کیے جاتے ہیں۔ لیکن جب بحران ٹل جاتا ہے تو اسی رفتار سے پالیسی کو ادارہ جاتی شکل دینے کا عمل سست پڑ جاتا ہے۔ یہی عدم تسلسل ہر دورے کے اثر کو کمزور کر دیتا ہے۔ اگر سخت زاویے سے دیکھا جائے تو ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کی خارجہ سفارت کاری کا Output واضح نہیں ہے۔

دنیا کے کئی ممالک میں کسی بھی اعلیٰ سطحی دورے کے بعد تین چیزیں لازمی دیکھی جاتی ہیں: سرمایہ کاری کا عملی آغاز، تجارتی حجم میں قابلِ پیمائش اضافہ اور پالیسی سطح پر دیرپا معاہدے۔ پاکستان میں اکثر اوقات پہلا قدم (اعلان) تو نظر آتا ہے، مگر دوسرا اور تیسرا قدم کمزور رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حکومت اپنے دوروں کو کامیابی کہتی ہے مگر مجموعی معاشی تصویر زیادہ تبدیل نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک غیر آرام دہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں سفارت کاری اور معیشت دو الگ ٹریکس پر چل رہے ہیں۔ سفارت کاری کی سطح پر روابط، دورے اور ملاقاتیں جاری رہتی ہیں، لیکن معیشت کی سطح پر Structural اصلاحات وہ رفتار نہیں پکڑتیں جو ان تعلقات کو فائدے میں بدل سکیں۔ جب تک اندرونی معاشی نظام مضبوط نہیں ہوگا، بیرونی دورے صرف امکانات پیدا کریں گے، نتائج نہیں۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ یہ دورے بے فائدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان

جیسے ملک کے لیے عالمی سطح پر موجود رہنا، بڑے شراکت داروں سے رابطے میں رہنا اور مالیاتی اداروں کے ساتھ مسلسل مذاکرات کرنا ناگزیر ہے۔ اگر یہ رابطے نہ ہوں تو تنہائی اور معاشی دباؤ مزید بڑھ سکتا ہے۔ لیکن مسئلہ "وجود" کا نہیں بلکہ "افادیت" کا ہے۔ اصل کمزوری وہاں ہے جہاں پالیسی کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر حکومت اپنے وژن کے مطابق نئے وعدے، نئے فریم ورک اور نئے معاہدے لے کر آتی ہے، لیکن ریاستی سطح پر ایک ایسا مستقل نظام موجود نہیں جو ان تمام اقدامات کو ایک طویل المدتی حکمتِ عملی میں جوڑ سکے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خارجہ دورے ایک سلسلہ وار کوشش تو ہوتے ہیں، مگر ایک مربوط معاشی حکمتِ عملی کا حصہ کم اور وقتی ردِعمل زیادہ لگتے ہیں۔ اگر اس بحث کو ایک جملے میں سمیٹا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ غیر ملکی دورے پاکستان کے لیے نہ مکمل بوجھ ہیں، نہ مکمل حل۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ہیں جن کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اندرونی نظام انہیں کتنی سنجیدگی سے "نتائج" میں بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب تک یہ بنیادی سوال حل نہیں ہوتا، تب تک ہر دورہ ایک ہی بحث کو جنم دیتا رہے گا: یہ ضرورت تھی یا خرچ؟ اور اس سوال کا جواب ہمیشہ صورتحال کے مطابق بدلتا رہے گا، حل کے مطابق نہیں۔ لیکن آخر میں صرف ایک بات سمجھیں کہ وزیرِاعظم میاں محمد شہباز شریف کے حالیہ دوروں کے باعث ہی دنیا تیسری عالمی جنگ سے بچ سکی ہے، ایران اور امریکہ کے درمیان معاہدہ ان دوروں کی بدولت ہی ممکن ہوا ہے۔

# بجٹ، آئی۔ایم۔ایف کا یا خود مختار پالیسی سازی کا؟

ناصر نقوی
(مصنف سینئر جرنلسٹ اور کالم نویس ہیں)

معاشی دباؤ، مہنگائی اور غیر یقینی کے ساتھ مسائل کے بحران میں حکومت نے 18 ہزار 771 ارب سے زائد حجم کا بجٹ پیش کرتے ہوئے یقین دہانی کرائی ہے کہ یہ عوامی ریلیف، معاشی استحکام اور اقتصادی ترقی کے لیے ایک جامع منصوبہ ثابت ہوگا۔ کیونکہ اس میں ٹیکس کم اور تنخواہیں زیادہ، تنخواہیں ہی زیادہ نہیں بلکہ 10 فیصد سرچارج کا خاتمہ، سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں 10 فیصد اور پنشنرز کی پنشن میں سات فیصد اضافے کے ساتھ برآمدی شعبے کے لیے خصوصی مراعات، آئی۔ ٹی سیکٹر کی رعایتی شرح کا تسلسل، پراپرٹی سیکٹر کے لیے ٹیکسوں میں نمایاں کمی، اوورسیز پاکستانیوں کے لیے ''کیپیٹل ویلیو ٹیکس'' کا خاتمہ، خواتین کی اشیائے ضروریہ کے ٹیکس میں چھوٹ اور صنعتوں کے لیے خصوصی سہولیات کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس لیے بجٹ 27-2026 محض آمدن اور اخراجات کا تخمینہ نہیں، ایک معاشی حکمت عملی ہے جس سے عوامی فلاح، سرمایہ کاری میں اضافہ، صنعتوں کے قیام سے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے اور پاکستان خود انحصاری کی حقیقی منزل کی جانب بڑھے گا۔

موجودہ غیر یقینی حالات، عالمی معاشی دباؤ اور بحرانی کیفیت میں حکومت نے نئے ٹیکسوں کی بھرمار کی بجائے ترقی اور سہولت کے نئے راستے اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اسی لیے وزیر خزانہ محمد اورنگزیب کا دعویٰ ہے کہ حکومت نے معیشت کو بحران سے نکال کر استحکام کی جانب بڑھنے کی راہ اپنائی ہے، لہٰذا پاکستان ترقی کے نئے دور میں داخل ہو جائے گا۔ بظاہر حقیقت بھی یہی دکھائی دیتی ہے، اس لیے کہ گزرے ہوئے سال میں زرِ مبادلہ کے ذخائر میں بہتری، افراطِ زر کی شرح میں کمی، کرنسی میں استحکام اور عالمی مالیاتی اداروں کے اعتماد میں کسی حد تک بحالی بھی ہوئی ہے۔

وزیر خزانہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ حکومت نے ایسا بجٹ پیش کیا ہے جس سے مالی نظم وضبط برقرار رہے اور عوامی ریلیف کی گنجائش بھی نکالی جا سکے۔ تنخواہ دار طبقات کے ٹیکسوں میں کمی بجٹ کا اہم اور مثبت پہلو اس لیے قرار دیا جا رہا ہے کہ یہی طبقہ ہمیشہ سب سے زیادہ ٹیکس براہِ راست ادا کرتا ہے۔ یقیناً مہنگائی کے ساتھ ٹیکسوں کا مسلسل بوجھ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ اس ریلیف سے انہیں ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا محسوس ہو گا۔

وزیراعظم شہباز شریف نے اپنے خطاب میں تسلیم کیا کہ ماضی میں آئی۔ایم۔ایف نے ٹیکس لگوائے، ہم نے معیشت سنبھالنے کے لیے ناگزیر مشکل فیصلے بھی کیے لیکن اب وعدے کے مطابق چیلنجز کی موجودگی میں بہتر بجٹ دیا ہے۔ ہم اس سے بھی زیادہ ریلیف کی کوشش کر رہے تھے لیکن محنت اور خلوص کے باوجود مشرقِ وسطیٰ کی وجہ سے ہمیں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے مشکل ترین حالات میں عوامی تعاون کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مہنگائی اور غیر معمولی فیصلے برداشت کیے۔

اگر بجٹ 2026 کا مجموعی غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو اسے متوازن اور ترقی وخوشحالی کا میزانیہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اپوزیشن نے حسبِ سابق بغیر پڑھے اور جائزہ لیے اسے نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ دعویٰ کیا کہ حکومت نے اعداد وشمار میں ہیرا پھیری کی، اس میں عوامی ریلیف بالکل نہیں، ماضی کی طرح یہ بجٹ بھی الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔

اپوزیشن کے احتجاج نے اس سوچ کو ایک مرتبہ پھر زندہ کر دیا کہ یہ بجٹ حکومتی معاشی پالیسی کا شاہکار نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی مالیاتی ادارے آئی۔ایم۔ایف کے دباؤ میں بنایا گیا ہے۔ حکومتی موقف ہے کہ بجٹ ریاستی معاملات کے پیشِ نظر معاشی استحکام اور مالی خسارے کو کم کر کے ترقی کی راہ ہموار کرنے کے لیے دیا گیا ہے لیکن ماہرینِ اقتصادیات اور ناقدین کی رائے ہے کہ بجٹ آئی۔ایم۔ایف پروگرام کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا، جو کہ حکومتی مجبوری تھی۔

موجودہ بجٹ میں وفاقی حکومت نے ٹیکس وصولیوں کے لیے نئے اہداف ترتیب دیے ہیں۔ تنخواہ دار طبقے، کاروباری شعبے اور مختلف سروسز پر ٹیکس نیٹ کو مزید وسعت دینے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ اسی طرح سرکاری اخراجات پر کنٹرول اور محصولات میں اضافے کے اقدامات بھی بجٹ کا اہم جزو ہیں جبکہ توانائی کے شعبے میں اصلاحات بھی ہوں گی۔ یہ تمام معاملات وہی ہیں جن پر آئی۔ایم۔ایف ایک طویل عرصے سے خسارے اور قرضوں کے بوجھ کی کمی کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا۔ حقیقت میں یہ تمام اقدامات انتہائی ضروری اس لیے تھے کہ ہم معاشی بہتری کے بغیر ترقی اور خوشحالی کی منزل نہیں پا سکتے۔ لیکن آئی۔ایم۔ایف نے ان شرائط پر زور دیا تھا، اس لیے بجٹ کو اسی تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان دہائیوں سے اپنے معاشی بحران کے خاتمے کے لیے آئی۔ایم۔ایف پروگراموں میں

شامل ہے، جس وجہ سے ادائیگی کے لیے ہر سال ٹیکسوں میں اضافہ، سبسڈیز میں کمی، بجلی اور گیس کی قیمتوں میں تبدیلیاں اور مالی بہتری کے لیے نئی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک رائے عامہ پیدا ہوگئی ہے کہ پاکستان ترقی پذیر اور مقروض ملک ہونے کے باعث ہمیشہ قرض دہندگان کی خواہشوں کے گرد گھومتا ہے، لہٰذا قومی ترجیحات پسِ پشت چلی جاتی ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ پاکستان برسوں سے ہی نہیں بلکہ موجودہ حالات میں بھی شدید مالی دباؤ کا شکار ہے۔

زرِ مبادلہ کے ذخائر، بیرونی قرضوں کی ادائیگی اور درآمدی معاملات میں بہتری آئی ہے لیکن ابھی ضرورت کے مطابق نہیں۔ لہٰذا ریاستی امور کو بطریقِ احسن چلانے کے لیے تمام شعبہ جاتی مجبوریوں کی وجہ سے آئی۔ ایم۔ ایف کے پاس جانا پڑتا ہے کیونکہ وہ صرف ایک مالیاتی معاہدہ نہیں، بین الاقوامی مالی اعتماد کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ اسی لیے پاکستان کی کوشش ہوتی ہے کہ آئی۔ ایم۔ ایف کے طے شدہ اہداف پورے کرے، ورنہ دیگر عالمی مالیاتی اداروں اور سرمایہ کاروں کا اعتماد بھی متاثر ہوسکتا ہے، جو کہ پاکستان کے لیے مشکلات میں اضافے کا باعث بنے گا۔ تاہم اصل مسئلہ آئی۔ ایم۔ ایف کا نہیں، پاکستان کی محدود معاشی خودمختاری ہے۔ جب کوئی بھی ملک ٹیکس اہداف میں اضافے، سرکاری اداروں میں اصلاحات، برآمدات بڑھانے اور غیر ضروری اخراجات کم کرنے میں ناکام رہے تو پھر اسے بیرونی اور بین الاقوامی اداروں کا دباؤ اور شرائط برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ معاشی خودمختاری دراصل مالی خودانحصاری سے ہی جڑی ہوتی ہے، لہٰذا مالی خودانحصاری کے بغیر خودمختار پالیسی

بھی محدود ہو جاتی ہے۔

موجودہ بجٹ میں خطے کے غیر یقینی حالات کے تحت دفاعی اخراجات میں اضافہ کیا گیا، ترقیاتی منصوبوں کے لیے فنڈز مختص کیے گئے اور تنخواہ دار طبقے کے لیے ریلیف کا اہتمام بھی کیا گیا لیکن محصولات کا بوجھ بھی نمایاں ہے۔ بس اسی تضاد نے اس بحث کو جنم دیا ہے کہ حکومت عوامی فلاح اور معاشی استحکام کے درمیان متوازن راستہ ڈھونڈ رہی ہے یا اس کی کوشش صرف آئی۔ایم۔ایف کے اہداف پورے کرنا ہے۔

غیر جانبدارانہ جائزہ یہی ہے کہ معاملہ وہ ہرگز نہیں جو سمجھا جا رہا ہے۔ بجٹ مکمل طور پر آئی۔ایم۔ایف کا تیار کردہ نہیں لیکن موجودہ حالات میں اسے بالکل علیحدہ کر کے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ ملکی حالات ایسے ہیں کہ موجودہ معاشی صورتحال میں حکومت کے پاس خود مختار پالیسی سازی کی گنجائش ہوتے ہوئے بھی وہ حالات کے جبر میں ایسی جکڑی ہوئی ہے کہ مکمل طور پر آزاد نہیں۔ اسی لیے بجٹ میں ایک سے زیادہ فیصلے قومی ضرورت اور بین الاقوامی مالی ذمہ داریوں کی مجبوری دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے ایسے سوال ہر بجٹ پر زیرِ بحث آتے ہیں کہ یہ قومی خود مختار پالیسی کے باعث بنایا گیا ہے یا حالات کے جبر میں بین الاقوامی مالی اداروں اور خصوصاً آئی۔ایم۔ایف کی منشا پر بنا ہے۔

اس بحث کے خاتمے کے لیے پاکستان کو ایک طویل المدتی معاشی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے لیکن اس کے لیے ٹیکس کے منصفانہ نظام، برآمدات میں خاطر خواہ اضافہ اور ریاستی مالی اداروں کا مستحکم و مضبوط ہونا لازمی امر ہے۔ ورنہ اس بحث و مباحثے کو کبھی بھی ختم نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ مقروض اور ترقی پذیر ممالک مالی اداروں کے دباؤ کے تحت کچھ کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنے مستقبل کی فکر میں مددگار مالی اداروں کی تجاویز مجبوراً تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔ اسی لیے ہر حکومت یہ راز جانتی ہے کہ معاشی خود مختاری کا راستہ آئی۔ایم۔ایف اور دیگر بین الاقوامی اداروں سے محاذ آرائی میں نہیں، اس کے لیے مضبوط معیشت ہی بنیاد ہے تاکہ بیرونی امداد اور قرضوں سے جان چھڑائی جا سکے۔

اشارے بتا رہے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے جنگی بادل چھٹنے کے بعد پاکستان بھی ایک نئے روپ میں دنیا کے سامنے آئے گا۔ وزیراعظم پاکستان کی اقتصادی ٹیم اور فیلڈ مارشل کے ویژن کے مطابق ایس۔آئی۔ایف۔سی نے معاشی بحران کے خاتمے کے لیے اہم اقدامات اٹھائے ہیں۔ پاکستان کی عالمی ثالثی سے ریاستی وقار اور اس کی قیادت پر عالمی سطح کا اعتماد پیدا ہوا ہے، جس کے ثمرات ضرور پاکستان کا مقدر بنیں گے۔ اگر پاکستان چند سالوں میں اپنی معاشی صورتحال میں بہتری لا کر اپنے وسائل سے اخراجات پورے کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہر بجٹ قومی خود مختار پالیسی کا آئینہ دار ہو گا اور آئی۔ایم۔ایف و دیگر بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے نجات کی صورت میں مداخلت، تجاویز اور دباؤ کی بحث ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ جائے گی۔

مجموعی طور پر مالی سال 27-2026 کا وفاقی بجٹ ایک متوازن اور ترقی و خوشحالی کی منصوبہ بندی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں عوامی ریلیف، نئی نسل کی ترقی، برآمدات کے فروغ، سرمایہ کاری، سماجی تحفظ اور جدید تقاضوں کے تحت ڈیجیٹل معاشی استحکام کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

اگر حالات میں مزید بہتری آئی اور حکومت اپنی حکمتِ عملی پر دیانتداری وشفافیت سے عمل درآمد کرنے میں کامیاب ہوگئی تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ متوازن بجٹ عام آدمی کی زندگی میں مثبت تبدیلی نہ لائے۔ پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت نے جس طرح شب وروز کی انتھک محنت سے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ ٹالا ہے، اس سے صرف سفارتی محاذ پر نہیں، ہر سطح پر پاکستان کی پذیرائی دنیا بھر میں ہوئی۔ مستقبل میں اس کے اثرات مثبت نتائج برآمد کریں گے۔

پاکستان اس وقت درست سمت میں ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہے۔ حالات نے ساتھ دیا، کوئی نیا بحران ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پیدا نہ ہوا تو یہ کامیابیوں کے نئے ریکارڈ بنانے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ غیر معمولی حالات میں غیر معمولی اور مشکل حکومتی فیصلے قوم نے برداشت کیے اب حکومت کو ایسے اقدامات کرنے ہوں گے جن سے متوازن بجٹ کو مثبت انداز میں ملک وقوم کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

# گلگت بلتستان انتخابات 2026

## مقامی خواہشات اور قومی سیاست کے درمیان

امتیاز احمد تارڑ

(کالم نگار اور اینکر ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں)

گلگت بلتستان پاکستان کا ایک نہایت اہم اور جغرافیائی طور پر حساس خطہ ہے، جو شمالی پہاڑی سلسلوں قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ علاقہ اپنی قدرتی خوبصورتی، بلند و بالا پہاڑوں، گلیشیئرز، سیاحتی اہمیت اور تزویراتی محل وقوع کے باعث نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

گلگت بلتستان کا کل رقبہ تقریباً بہتر ہزار نو سو اکہتر مربع کلومیٹر ہے، جس میں دشوار گزار پہاڑی علاقے، وادیاں، دریا اور برف پوش چوٹیاں شامل ہیں۔ یہاں دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو بھی موجود ہے، جو اس خطے کو عالمی سیاحت اور ماؤنٹین کلائمبنگ کے لیے ایک مرکز بناتی ہے۔ اس خطے کی آبادی مختلف مردم شماری کے مطابق تقریباً پندرہ لاکھ کے قریب ہے، اگرچہ جغرافیائی دشواریوں اور نقل مکانی کے باعث اس میں معمولی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ آبادی کا بڑا حصہ دیہی علاقوں میں رہتا ہے جبکہ شہری آبادی نسبتاً کم ہے۔ یہاں کے لوگ مختلف لسانی اور ثقافتی پس منظر رکھتے ہیں جن میں شینا، بلتی، بروشسکی، وخی اور دیگر زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ لسانی و ثقافتی تنوع اس خطے کی ایک بڑی شناخت ہے۔

گلگت بلتستان میں انتخابی عمل اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے رجسٹرڈ ووٹرز کی تعداد بھی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ دستیاب سرکاری اور انتخابی اعداد و شمار کے مطابق یہاں رجسٹرڈ ووٹرز کی تعداد تقریباً نو لاکھ سے دس لاکھ کے درمیان ہے۔ ان ووٹرز میں مردوں کی تعداد خواتین کے مقابلے

میں زیادہ ہے۔ اندازاً مرد ووٹرز کی تعداد پانچ سے ساڑھے پانچ لاکھ کے درمیان جبکہ خواتین ووٹرز کی تعداد چار سے ساڑھے چار لاکھ کے درمیان ہے۔ یہ فرق اس خطے میں سماجی ساخت، رجسٹریشن کے مسائل اور بعض علاقوں میں خواتین کی رسائی کی محدود سہولیات کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود حالیہ برسوں میں خواتین کی سیاسی شمولیت میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جو ایک مثبت رجحان ہے۔ اٹھارہ سال سے کم عمر افراد کی آبادی اس خطے میں مجموعی آبادی کا تقریباً پینتیس سے چالیس فیصد بنتی ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ ایک نوجوان آبادی والا خطہ ہے اور مستقبل کی سیاسی و معاشی سمت میں نوجوانوں کا کردار بہت اہم ہوگا۔

تعلیمی ڈھانچے کے لحاظ سے گلگت بلتستان میں مختلف سطح کے تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لیے سرکاری اور نجی اسکولوں کا ایک وسیع نیٹ ورک موجود ہے جو تقریباً ہر ضلع اور تحصیل میں پھیلا ہوا ہے۔ مجموعی طور پر اسکولوں کی تعداد ہزاروں میں ہے جن میں پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول شامل ہیں۔ ان اداروں کا بنیادی مقصد خطے کے دور دراز علاقوں تک تعلیم کی رسائی کو ممکن بنانا ہے، اگرچہ جغرافیائی مشکلات اور وسائل کی کمی اب بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔ کالجز کی سطح پر بھی گلگت بلتستان میں مختلف سرکاری اور نیم سرکاری ادارے کام کر رہے ہیں۔ ہر ضلع میں کم از کم ایک یا زیادہ کالجز موجود ہیں جبکہ خواتین کے لیے الگ کالجز بھی قائم کیے گئے ہیں تاکہ تعلیمی مواقع میں صنفی فرق کو کم کیا جا سکے۔ مجموعی طور پر کالجز کی تعداد پچاس سے سو کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اس خطے میں دو بڑی جامعات موجود ہیں، جن میں قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی گلگت اور یونیورسٹی آف بلتستان اسکردو شامل ہیں۔ یہ دونوں ادارے خطے کے طلبہ و طالبات کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کر رہے ہیں اور مختلف شعبہ جات میں تعلیمی سرگرمیوں کو فروغ دے رہے ہیں۔ تاہم، طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مقابلے میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کی محدود تعداد ایک بڑا مسئلہ ہے جس پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

صحت کے شعبے میں گلگت بلتستان کو کئی چیلنجز کا سامنا ہے۔ اگرچہ ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال موجود ہیں اور تحصیل سطح پر بنیادی صحت مراکز بھی کام کر رہے ہیں، لیکن جدید طبی سہولیات کی کمی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ بڑے اور چھوٹے ہسپتالوں کی مجموعی تعداد تقریباً بیس سے چالیس کے درمیان ہے جبکہ بنیادی صحت مراکز کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے اور یہ سینکڑوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دور دراز علاقوں میں مریضوں کو بروقت طبی امداد فراہم کرنا ایک مشکل کام ہے کیونکہ سڑکوں کی حالت اور فاصلوں کی زیادتی علاج میں تاخیر کا باعث بنتی ہے۔ گلگت بلتستان میں ایک اہم میڈیکل کالج بھی موجود ہے، جو مقامی سطح پر ڈاکٹروں کی تیاری میں اہم کردار ادا کر رہا ہے، تاہم ماہر ڈاکٹروں اور جدید سہولیات کی کمی اب بھی برقرار ہے۔

سیاسی و انتظامی لحاظ سے گلگت بلتستان کی اپنی ایک منفرد حیثیت ہے۔ اس خطے میں موجودہ سیاسی ڈھانچہ دو ہزار نو کے گلگت بلتستان ایمپاورمنٹ اینڈ سیلف گورننس آرڈر کے تحت قائم ہوا، جس کے بعد یہاں ایک قانون ساز اسمبلی تشکیل دی گئی۔ گلگت بلتستان اسمبلی کا قیام دو

ہزار نو میں عمل میں آیا اور اس نے خطے کو محدود مگر اہم سیاسی خود مختاری فراہم کی۔ اس اسمبلی میں کل تینتیس نشستیں ہیں، جن میں چوبیس عمومی نشستیں براہ راست انتخابات کے ذریعے پُر کی جاتی ہیں، چھ نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہیں جبکہ تین نشستیں ٹیکنوکریٹس اور خصوصی نمائندوں کے لیے مختص ہیں۔ یہ اسمبلی قانون سازی، بجٹ کی منظوری اور مقامی ترقیاتی امور کی نگرانی جیسے اہم فرائض انجام دیتی ہے، تاہم دفاع، خارجہ امور اور بڑے آئینی معاملات وفاقی حکومت کے دائرہ اختیار میں رہتے ہیں۔

گلگت بلتستان کے عوام کی سیاسی اور سماجی خواہشات وقت کے ساتھ مزید واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ اس خطے کا سب سے بڑا سیاسی مطالبہ اس کی آئینی حیثیت کا تعین ہے۔ عوام کی بڑی اکثریت چاہتی ہے کہ گلگت بلتستان کو پاکستان کے آئین میں مکمل طور پر شامل کیا جائے تاکہ انہیں قومی اسمبلی اور سینیٹ میں باقاعدہ نمائندگی حاصل ہو سکے۔ لیکن میں ابھی تک قانونی طور پر کئی رکاوٹیں موجود ہیں۔ حال ہی میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو زرداری نے بھی قومی اسمبلی میں اپنی بجٹ سیشن تقریر میں اسکا مطالبہ کیا تھا کہ گلگت بلتستان کو قومی اسمبلی اور سینٹ میں بھی نمائندگی دی جائے۔

اس کے علاوہ تعلیم، صحت، روزگار اور بنیادی ڈھانچے کی بہتری بھی اہم عوامی مطالبات میں شامل ہیں۔ نوجوان نسل روزگار کے مواقع کی کمی سے متاثر ہے اور سرکاری نوکریوں میں شفافیت کا مطالبہ بھی زور پکڑ رہا ہے۔ سیاحت کے شعبے کو ترقی دے کر روزگار پیدا کرنے کی خواہش

بھی نمایاں ہے کیونکہ یہ خطہ قدرتی حسن سے مالا مال ہے اور دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے کشش رکھتا ہے۔ تعلیم کے حوالے سے عوام بہتر اسکولوں، جدید کالجز اور نئی یونیورسٹیوں کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ صحت کے شعبے میں جدید ہسپتالوں، ایمرجنسی سروسز اور ماہر ڈاکٹروں کی دستیابی کو ایک بنیادی ضرورت سمجھا جاتا ہے۔

انفراسٹرکچر کے مسائل بھی انتہائی اہم ہیں کیونکہ پہاڑی علاقوں میں سڑکوں کی خستہ حالی اور موسم سرما میں راستوں کی بندش عوام کی روزمرہ زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ اسی طرح بجلی اور پانی کی فراہمی بھی ایک مستقل مسئلہ ہے، اگرچہ یہ خطہ آبی وسائل سے مالا مال ہے لیکن اس کے باوجود لوڈشیڈنگ اور توانائی کی کمی ایک بڑا چیلنج ہے۔ گلگت بلتستان میں انتخابات محض سیاسی جماعتوں کے درمیان مقابلہ نہیں ہوتے بلکہ یہ اس خطے کے عوام کی امیدوں، مسائل اور مستقبل کے وژن کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ یہاں کے انتخابات میں قومی سیاست کے اثرات بھی نمایاں ہوتے ہیں کیونکہ بڑی سیاسی جماعتیں وفاقی سطح پر اپنی پالیسیوں کے ذریعے یہاں اثر انداز ہوتی ہیں۔ دوسری طرف مقامی جماعتیں اور رہنما علاقائی مسائل کو زیادہ بہتر انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گلگت بلتستان کے انتخابات ہمیشہ ایک پیچیدہ سیاسی منظرنامہ پیش کرتے ہیں، جہاں مقامی خواہشات اور قومی سیاست کے درمیان ایک مسلسل توازن قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر گلگت بلتستان ایک ایسا خطہ ہے جو اپنی جغرافیائی اہمیت، قدرتی وسائل، نوجوان آبادی اور سیاسی حساسیت کے باعث منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہاں کے انتخابات اور سیاسی عمل نہ صرف اس خطے کے مستقبل بلکہ پاکستان کے مجموعی سیاسی ڈھانچے پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

حالیہ گلگت بلتستان انتخابات کے حوالے سے حتمی اور سرکاری سطح پر مکمل پارٹی پوزیشن کے اعداد و شمار ہر حلقے کے نتیجے کے بعد ہی واضح ہوتے ہیں اور دستیاب اطلاعات میں مختلف نشستوں پر آزاد امیدواروں اور بڑی جماعتوں کے درمیان مقابلہ بکھرا ہوا نظر آتا ہے، جہاں کسی ایک پارٹی کو واضح اور فیصلہ کن اکثریت حاصل ہونا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ مجموعی سیاسی منظرنامہ اس وقت مخلوط نوعیت اختیار کیے ہوئے ہے، جس میں پاکستان تحریک انصاف، پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ساتھ کئی آزاد امیدوار بھی اہم حیثیت رکھتے ہیں، حکومت سازی کے لیے اتحادی سیاست ناگزیر دکھائی دیتی ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی پی پی پی نے اپنے صوبائی صدر امجد حسین ایڈووکیٹ کو گلگت بلتستان (جی بی) خطے کے وزیرِ اعلیٰ کے عہدے کے لیے نامزد کیا ہے، یہ پیشرفت جی بی کے الیکشن کمیشن کے اس اعلان کے چند گھنٹے بعد ہوئی ہے کہ پی پی پی نے خطے میں حال ہی میں ہونے والے عام انتخابات میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں۔

پارٹی نے ایک بیان میں کہا: چیئرمین بلاول بھٹو زرداری نے پاکستان پیپلز پارٹی کے صوبائی صدر امجد ایڈووکیٹ کو گلگت بلتستان کا وزیرِ اعلیٰ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پارٹی نے کہا کہ بلاول بھٹو زرداری نے امجد حسین سے فون پر بات کی جس کے دوران انہوں نے پیپلز

پارٹی کے رکن کو حکومت سازی اور عوام کے آئینی اور معاشی حقوق پر عمل درآمد سے متعلق ہدایات جاری کیں۔ یاد رکھیں! سات جون کو ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے ووٹ کاسٹ کرنے کے لیے پورے جی بی کے پولنگ سٹیشنوں پر پہنچے۔ تاہم متعدد حلقوں کے نتائج زیرِ التوار ہے کیونکہ انتخابی حکام کو منتخب پولنگ سٹیشنوں میں دوبارہ جزوی پولنگ مکمل ہونے کا انتظار تھا۔ نیم خودمختار خطے میں انتخابات میں بے ضابطگیوں اور طریقہ کار سے متعلق خدشات کے حوالے سے متعدد سیاسی جماعتوں نے شکایات کیں جس کی وجہ سے یہ تاخیر ہوئی۔ گلگت بلتستان دنیا کی چند بلند ترین

پہاڑی چوٹیوں کا مسکن ہے اور پاکستان اور چین کے درمیان تجارت کے لیے ایک اہم گیٹ وے ہے۔ جی بی الیکشن کمیشن نے جمعہ کو حتمی انتخابی نتائج جاری کیے، جس میں پی پی پی نے نو نشستوں پر کامیابی حاصل کی اس کے بعد مسلم لیگ ن چھ اور استحکامِ پاکستان پارٹی (آئی پی پی) چار نشستوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر رہی۔ الیکشن کمیشن نے مخصوص نشستوں کا بھی نوٹیفکیشن جاری کیا جس سے 33 رکنی اسمبلی میں پی پی پی کی 13، مسلم لیگ (ن) کی نو اور آئی پی پی کی نشستیں چھے ہوگئیں۔

مجلسِ وحدت المسلمین نے ایک نشست حاصل کی جبکہ ایک آزاد امیدوار بھی انتخاب میں کامیاب ہوا۔ قانونی اور انتخابی کارروائیوں کی وجہ سے تین حلقوں کے سرکاری نتائج ابھی آنا باقی ہیں۔ اس وقت اتحادی حکومت بنانے کے لیے مسلم لیگ ن نے پیپلز پارٹی سے مذاکرات کر رکھے ہیں۔ ایسے ماحول میں عوامی خدشات زیادہ تر گورننس کے معیار، روزگار کے مواقع، بنیادی ڈھانچے کی بہتری، تعلیم اور صحت کے نظام

کی حالت، اور آئینی و سیاسی نمائندگی کے دائرہ اختیار کے گرد مرکوز ہیں۔ عوام یہ توقع رکھتے ہیں کہ نئی حکومت محض سیاسی بیانات تک محدود نہیں رہے گی بلکہ دیرینہ مطالبات جیسے اختیارات کی منتقلی، شفاف ترقیاتی منصوبے اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کو عملی شکل دے گی۔ مجموعی طور پر یہ انتخابات خطے کو ایک ایسے موڑ پر لے آئے ہیں، جہاں سیاسی عدم استحکام اور مخلوط حکومتوں کی مجبوری کے ساتھ ساتھ ترقی اور نمائندگی کے وعدوں کو پورا کرنا اصل امتحان ہوگا۔

گلگت بلتستان کی انتخابی سیاست میں یہ تضاد صرف وقتی نہیں بلکہ ایک مسلسل ساختی مسئلہ بن چکا ہے۔ یہاں سیاسی عمل اکثر دو مختلف سمتوں میں بٹ جاتا ہے: ایک طرف زمینی حقیقتیں ہیں، جہاں عوام کو فوری اور عملی حل درکار ہوتے ہیں اور دوسری طرف پارٹی سیاست ہے جو بڑے قومی بیانیے، مرکز میں حکومت سازی کے امکانات اور سیاسی اتحادوں کے حساب سے چلتی ہے۔ اس فرق کی وجہ سے مقامی سطح پر جو مسائل سب سے زیادہ شدت رکھتے ہیں، وہ انتخابی منشور میں تو نمایاں ہو جاتے ہیں مگر اقتدار میں آنے کے بعد ترجیحات کی فہرست میں نیچے چلے جاتے ہیں۔ اس صورتحال کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ انتخابی مہمات میں جذباتی نعرے اور وقتی وعدے تو بھرپور نظر آتے ہیں لیکن ادارہ جاتی اصلاحات اور طویل المدتی منصوبہ بندی نسبتاً کمزور رہتی ہے۔

گلگت بلتستان جیسے خطے میں جہاں جغرافیائی چیلنجز، محدود معاشی مواقع اور انفراسٹرکچر کی کمی پہلے ہی ترقی کی رفتار کو سست رکھتے ہیں، وہاں یہ سیاسی عدم تسلسل مزید رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ عوام کو ہر انتخاب میں نئی امیدیں دی جاتی ہیں مگر پچھلے وعدوں کی تکمیل کا احتسابی نظام کمزور ہونے کی وجہ سے اعتماد کا بحران جنم لیتا ہے۔ مزید یہ کہ مقامی قیادت اکثر قومی جماعتوں کے اندرونی ڈھانچے اور مرکز کی پالیسیوں کے تابع ہو جاتی ہے، جس سے فیصلہ سازی کی خودمختاری محدود ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً عوامی نمائندے اپنی مقامی ترجیحات کو مکمل طور پر نافذ کرنے کی بجائے پارٹی لائن کے مطابق چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گلگت بلتستان میں سیاسی تسلسل کمزور اور انتخابی سیاست زیادہ تر ردعمل پر مبنی رہتی ہے، جس کا براہ راست اثر ترقیاتی رفتار اور عوامی اطمینان پر پڑتا ہے۔

# پاکستان کا آئینی مباحثہ
# 18ویں ترمیم بمقابلہ 28ویں آئینی ترمیم کی تجویز

ڈاکٹر محمد گلزار
(ایسوسی ایٹ پروفیسر، ڈائریکٹر سکول آف کامرس اینڈ اکاؤنٹنسی - یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی (UMT))

پاکستان کا آئینی سفر مسلسل تجربات، ترامیم اور مرکز وصوبوں کے درمیان طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ 1973ء کا متفقہ آئین، جو تمام سیاسی قوتوں کے اتفاقِ رائے سے منظور ہوا، بنیادی طور پر ایک وفاقی اور پارلیمانی نظام کی ضمانت دیتا تھا جس کا مقصد پاکستان جیسے کثیر الثقافتی اور کثیر اللسانی ملک کی تمام اکائیوں کو یکساں حقوق فراہم کرنا تھا۔ تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ آمرانہ ادوار، بالخصوص جنرل ضیاء الحق کے آٹھویں ترمیم اور جنرل پرویز مشرف کے سترہویں ترمیم کے ادوار میں کی جانے والی ساختی تبدیلیوں نے اس کی اصل وفاقی روح کو مسخ کر دیا، جس کے نتیجے میں اختیارات کا جھکاؤ دوبارہ مضبوط مرکز کی طرف ہو گیا اور چھوٹے صوبوں میں احساسِ محرومی شدت اختیار کر گیا۔ انہی تاریخی ناانصافیوں کا ازالہ کرنے، مرکز کی حد سے بڑھی ہوئی مداخلت کو روکنے اور صوبائی خودمختاری کے دیرینہ جمہوری مطالبات کو پورا کرنے کے لیے اپریل 2010ء میں اٹھارویں آئینی ترمیم منظور کی گئی، جسے ملکی تاریخ میں وفاقیت کے ارتقا اور صوبائی خودمختاری کا ایک بے مثال سنگِ میل مانا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے چند برسوں سے، اور خصوصاً موجودہ دور کے انتہائی پیچیدہ سیاسی و معاشی تناظر میں، مقتدر حلقوں، بیوروکریسی اور بعض مرکزی حکومتوں کی جانب سے ایک نئی بحث کا آغاز کیا گیا ہے کہ کیا اٹھارویں ترمیم نے مرکز کو معاشی طور پر مفلوج کر دیا ہے، اور کیا موجودہ مالیاتی بحران کا حل ایک نئی اٹھائیسویں آئینی ترمیم کی صورت میں نکالنا ناگزیر ہو چکا ہے۔

اپریل 2010ء میں پارلیمنٹ سے متفقہ طور پر منظور ہونے والی اٹھارویں آئینی ترمیم محض چند شقوں کی تبدیلی نہیں تھی، بلکہ اس نے

آئین کی تقریباً 102 دفعات کو متاثر کر کے پورے ریاستی ڈھانچے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اس ترمیم کے تحت اٹھایا جانے والا سب سے بڑا اور انقلابی قدم مشترکہ مفادات کی فہرست (Concurrent List) کا مکمل خاتمہ تھا، جس کے بعد صحت، تعلیم، لوکل گورنمنٹ، زراعت، سیاحت، اور ماحولیات جیسے اہم و بنیادی شعبے، جو پہلے مرکز اور صوبوں کے درمیان مشترکہ تھے، مکمل طور پر صوبوں کے دائرہ اختیار میں دے دیے گئے اور وفاق کا کردار صرف دفاع، خارجہ امور، کرنسی، اور ملک گیر مواصلات تک محدود کر دیا گیا۔ اس انتظامی تبدیلی کو پائیدار بنانے کے لیے مالیاتی خودمختاری کا بڑا نیٹ ورک تیار کیا گیا، جس کے تحت آئین کے آرٹیکل 160 میں ایک نئی شق (3A) کا اضافہ کر کے یہ قانون بنا دیا گیا کہ قومی مالیاتی کمیشن (NFC) کے اگلے کسی بھی ایوارڈ میں صوبوں کا حصہ گزشتہ ایوارڈ کے حصے (جو کہ ساتویں این ایف سی ایوارڈ کے تحت 57.5 فیصد تھا) سے کم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ، آرٹیکل 172(3) کے ذریعے صوبوں کو ان کی حدود میں نکلنے والے تیل، گیس اور دیگر قدرتی وسائل پر وفاق کے ساتھ برابر (50:50) کا حصہ دار بنا دیا گیا، اور صوبوں کو اپنے ہائیر ایجوکیشن کمیشن (HEC) قائم کرنے کے ساتھ ساتھ بیرونی واندرونی قرضے لینے کے لیے کسی حد تک خودمختاری بھی تفویض کر دی گئی تا کہ وہ اپنے فیصلے خود کر سکیں۔

اگرچہ اٹھارویں ترمیم کو جمہوریت پسند اور قوم پرست قوتیں پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی آئینی فتح سمجھتی ہیں، لیکن پاکستان کے سیکیورٹی اسٹیبلشمنٹ، وفاقی مقتدرہ اور بعض معاشی ماہرین کی جانب سے اس کے مالیاتی اور انتظامی نتائج پر شدید ترین تحفظات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ ناقدین کا سب سے بڑا اعتراض ملکی تاریخ کے سب سے بڑے مالیاتی عدم توازن (Fiscal Asymmetry) پر ہے، ان کا مؤقف ہے کہ وفاقی پول (Divisible Pool) سے 57.5 فیصد رقم صوبوں کو منتقل ہونے اور آزادانہ طور پر ایف بی آر کے جمع کردہ ریونیو کا بڑا حصہ نکل جانے کے بعد مرکز کے پاس جو 42.5 فیصد حصہ بچتا ہے، وہ ملک کے دو سب سے بڑے اور ناگزیر اخراجات یعنی دفاعی بجٹ اور ماضی کے جمع شدہ کھربوں روپے کے اندرونی و بیرونی قرضوں کی سود سمیت ادائیگی (Debt Servicing) کو پورا کرنے کے لیے بھی شدید ناکافی ہوتا ہے۔ اس سنگین صورتحال کے نتیجے میں وفاق کو اپنے روزمرہ کے بنیادی امور چلانے، سول انتظامیہ کو برقرار رکھنے اور وفاقی ترقیاتی پروگراموں (PSDP) کے لیے مسلسل نئے اور مہنگے قرضے لینے پڑتے ہیں، جس سے ملک ایک لامتناہی معاشی دلدل اور قرضوں کے چکر میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ مزید برآں، یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ صوبوں کو فنڈز اور اختیارات تو منتقل کر دیے گئے، لیکن صوبائی حکومتوں کے پاس اتنے بڑے محکموں اور کھربوں روپے کے بجٹ کو شفافیت سے سنبھالنے کی انتظامی صلاحیت (Administrative Capacity) ہی موجود نہیں تھی، جس کی وجہ سے سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا کے دور دراز اضلاع میں صحت اور تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ بہتر ہونے کے بجائے مزید زوال پذیر ہوا، اور صوبوں نے وفاق سے تو اختیارات لے لیے لیکن آرٹیکل A-140 کی روح کے برعکس آگے ضلعی اور بلدیاتی حکومتوں کو فنڈز اور سیاسی طاقت منتقل کرنے سے واضح گریز کیا، جس سے عوام کو نچلی سطح پر اس تاریخی ترمیم کا کوئی براہِ راست فائدہ نہیں پہنچ سکا۔

انہی بڑھتے ہوئے مالیاتی نقصانات اور عالمی مالیاتی اداروں، بالخصوص آئی ایم ایف (IMF) کی طرف سے میکرو اکنامک استحکام کے لیے دباؤ کے پیشِ نظر، اب پسِ پردہ اور علانیہ طور پر ایک اٹھائیسویں آئینی ترمیم کا مسودہ اور تجاویز زیرِ بحث لائی جا رہی ہیں تاکہ وفاقی ڈھانچے کو معاشی دیوالیہ پن سے بچایا جا سکے۔ اس مجوزہ اٹھائیسویں ترمیم کا بنیادی اور سب سے اہم ہدف این ایف سی ایوارڈ کے موجودہ آئینی فارمولے پر نظرِ ثانی کرنا ہے، جس کے تحت یہ قانونی ترمیم تجویز کی جا رہی ہے کہ ملک کے مجموعی دفاعی اخراجات اور بیرونی قرضوں کی قسطوں کو سب سے پہلے "قومی واجبات" قرار دے کر کل وفاقی ریونیو سے منہا کیا جائے، اور اس کٹوتی کے بعد بچ جانے والی نیٹ رقم کو مرکز اور صوبوں کے درمیان تقسیم کیا جائے تاکہ وفاق کو معاشی طور پر سانس لینے کا موقع مل سکے۔ اس کے ساتھ ہی، قانون سازی اور ریاستی پالیسیوں میں پائے جانے والے تضاد کو ختم کرنے کے نام پر ہائیر ایجوکیشن کمیشن (HEC)، ماحولیاتی تحفظ، اور صحت کے بعض ریگولیٹری امور کو دوبارہ جزوی یا مکمل

طور پر وفاق کے کنٹرول میں دینے کی وکالت کی جا رہی ہے تاکہ پورے ملک میں یکساں تعلیمی و کاروباری معیار قائم ہو سکے۔ تاہم، اس ترمیم کے حامی اس کے سیاسی وزن کو بڑھانے کے لیے اس میں ایک عوامی کارڈ بھی شامل کرنا چاہتے ہیں، جس کے تحت آرٹیکل 140-A کو مزید سخت بنا کر صوبائی حکومتوں کے لیے یہ آئینی طور پر لازمی قرار دیا جائے گا کہ وہ نیشنل فنانس کمیشن کی طرز پر صوبائی فنانس کمیشن (PFC) کے ذریعے فنڈز کا ایک طے شدہ حصہ براہِ راست منتخب بلدیاتی اداروں کو منتقل کریں، جس سے صوبائی وزرائے اعلیٰ کے پاس فنڈز کا ارتکاز ختم ہو

جائے گا۔

سیاسی اور پارلیمانی میدان میں اس مجوزہ اٹھائیسویں ترمیم کا راستہ روکنے کے لیے ایک بہت بڑا آئینی ڈیڈلاک موجود ہے، کیونکہ آئین کے آرٹیکل 238 اور 239 کے تحت کسی بھی ترمیم کی منظوری کے لیے سینیٹ اور قومی اسمبلی دونوں ایوانوں میں الگ الگ دو تہائی اکثریت (2/3Majority) کا ہونا لازمی شرط ہے، جہاں ملکی سیاسی جماعتیں اس وقت واضح طور پر دو دھڑوں میں تقسیم نظر آتی ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی اٹھارویں ترمیم کو اپنے دورِ حکومت کا سب سے بڑا تاریخی اور سیاسی اثاثہ سمجھتی ہے اور اس کا مستقل بیانیہ ہے کہ صوبائی خودمختاری پر کسی بھی قسم کا سمجھوتہ یا رول بیک ملکی وفاق پر حملے کے مترادف ہوگا، اور چونکہ سینیٹ میں ان کی عددی پوزیشن انتہائی مضبوط ہے، اس لیے ان کی رضامندی کے بغیر کسی بھی ترمیم کا پاس ہونا تکنیکی طور پر ناممکن ہے۔ اسی طرح، بلوچستان، سندھ اور خیبر پختونخوا کی قوم پرست اور علاقائی جماعتیں بھی اٹھارویں ترمیم میں کسی بھی قسم کی مداخلت کو چھوٹے صوبوں کے حقوق پر ڈاکا، وسائل پر قبضے کی کوشش اور احساسِ محرومی کو ہوا دینے کا سبب قرار دے کر شدید مزاحمت کا اعلان کر چکی ہیں۔ اس کے برعکس، پاکستان مسلم لیگ (ن) روایتی طور پر ایک مرکز پسند جماعت رہی ہے اور سیکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مل کر اس کا مؤقف یہ ہے کہ شدید ترین معاشی بحران اور بیرونی ڈیفالٹ کے خطرات سے نمٹنے کے لیے صوبوں کو اپنی معاشی ذمہ داریوں میں حصہ دار بننا ہی ہوگا، جس کی وجہ سے اسلام آباد اور صوبائی دارالحکومتوں کے درمیان ایک شدید سیاسی کھینچا تانی کی کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔

اس گہرے آئینی اور سیاسی تعطل کو توڑنے اور پاکستان کو کسی نئے اندرونی خلفشار یا وفاقی تصادم سے محفوظ رکھنے کے لیے ملک کے جید آئینی ماہرین اور غیر جانبدار ماہرینِ معاشیات ایک معتدل اور درمیانی راستے (Middle Ground) کی وکالت کرتے ہیں۔ اس کا بنیادی حل یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ وفاق سے ملنے والے فنڈز پر انحصار کرنے اور مرکز کے حصے میں کٹوتی کرنے کے بجائے، صوبوں کو اپنے ٹیکس وصولی کے نظام کو جدید اور وسیع بنانا چاہیے اور اٹھارویں ترمیم کے تحت ملنے والے اختیارات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زرعی انکم ٹیکس (Agricultural Income Tax)، سروسز پر سیلز ٹیکس اور ریل اسٹیٹ جیسے بڑے شعبوں سے حقیقی معنوں میں ٹیکس وصول کرنا چاہیے تاکہ ملکی ریونیو میں اضافہ ہو اور وفاق پر بوجھ کم ہو۔ اس کے ساتھ ہی، وفاقی حکومت کو بھی اپنے اندرونی اخراجات کو سختی سے قابو میں لانا ہوگا؛ جو محکمے اور وزارتیں مکمل طور پر صوبوں کو منتقل ہو چکی ہیں، مرکز میں ان کی متوازی وزارتوں اور بیوروکریسی کے بھاری بھرکم ڈھانچے کو فوری طور پر ختم یا ضم کیا جانا چاہیے تاکہ اسلام آباد کے غیر ضروری اخراجات بچ سکیں۔ اگر اٹھائیسویں ترمیم کا پوشیدہ مقصد محض اختیارات کو دوبارہ مرکز میں مرکوز کرنا ہے تو یہ ملک میں عدم استحکام کا باعث بنے گی، لیکن اگر تمام سیاسی اسٹیک ہولڈرز مل بیٹھ کر ایک ایسے جامع معاشی فریم ورک پر متفق ہو جائیں جہاں صوبے قومی دفاع اور قرضوں کی ادائیگی میں اپنی جی ڈی پی کے تناسب سے حصہ ڈالیں اور بدلے میں بلدیاتی اداروں کو حقیقی مالی و

سیاسی طاقت منتقل کی جائے، تو یہ پاکستان کی معاشی اور جمہوری بقا کے لیے گیم چینجر ثابت ہوسکتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ پاکستان کا موجودہ آئینی مباحثہ محض چند قانونی شقوں کی جنگ نہیں، بلکہ یہ ایک گہری نظریاتی کشمکش ہے جہاں ایک سوچ ایک انتہائی طاقتور مرکز کو ملکی سلامتی اور معاشی بقا کے لیے ناگزیر سمجھتی ہے، جبکہ دوسری سوچ یہ مانتی ہے کہ پاکستان جیسے متنوع ملک میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ مالی و سیاسی آزادی دینے سے ہی وفاق کو حقیقی استحکام مل سکتا ہے۔ اٹھارویں ترمیم نے بلاشبہ صوبوں کو دیرینہ حقوق اور تاریخی شناخت دی لیکن وفاق کے بدلتے ہوئے معاشی حقائق اور مرکز کے دیوالیہ پن کے خطرات کو کسی حد تک نظرانداز کیا، جبکہ مجوزہ اٹھائیسویں ترمیم اگر کسی سیاسی اتفاقِ رائے کے بغیر زبردستی یا دباؤ کے تحت نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو اس سے صوبائی اکائیوں میں شدید بے چینی پھیلے گی اور ملکی یکجہتی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ پاکستان کی حقیقی پائیداری اور معاشی ترقی کسی ایک نظریے کی دوسرے پر مطلق فتح میں نہیں، بلکہ ایک ایسے متوازن، لچکدار اور جدید آئینی ماڈل میں پنہاں ہے جہاں مرکز معاشی و دفاعی طور پر مستحکم ہو اور صوبے انتظامی و مالیاتی طور پر جوابدہ اور خودمختار ہوں، جس کے لیے موجودہ دور کی تمام سیاسی و عسکری قیادت کو اپنے ذاتی اور جماعتی مفادات سے بالاتر ہو کر ایک نئے دوراندیش "میثاقِ معیشت و وفاق" پر سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔

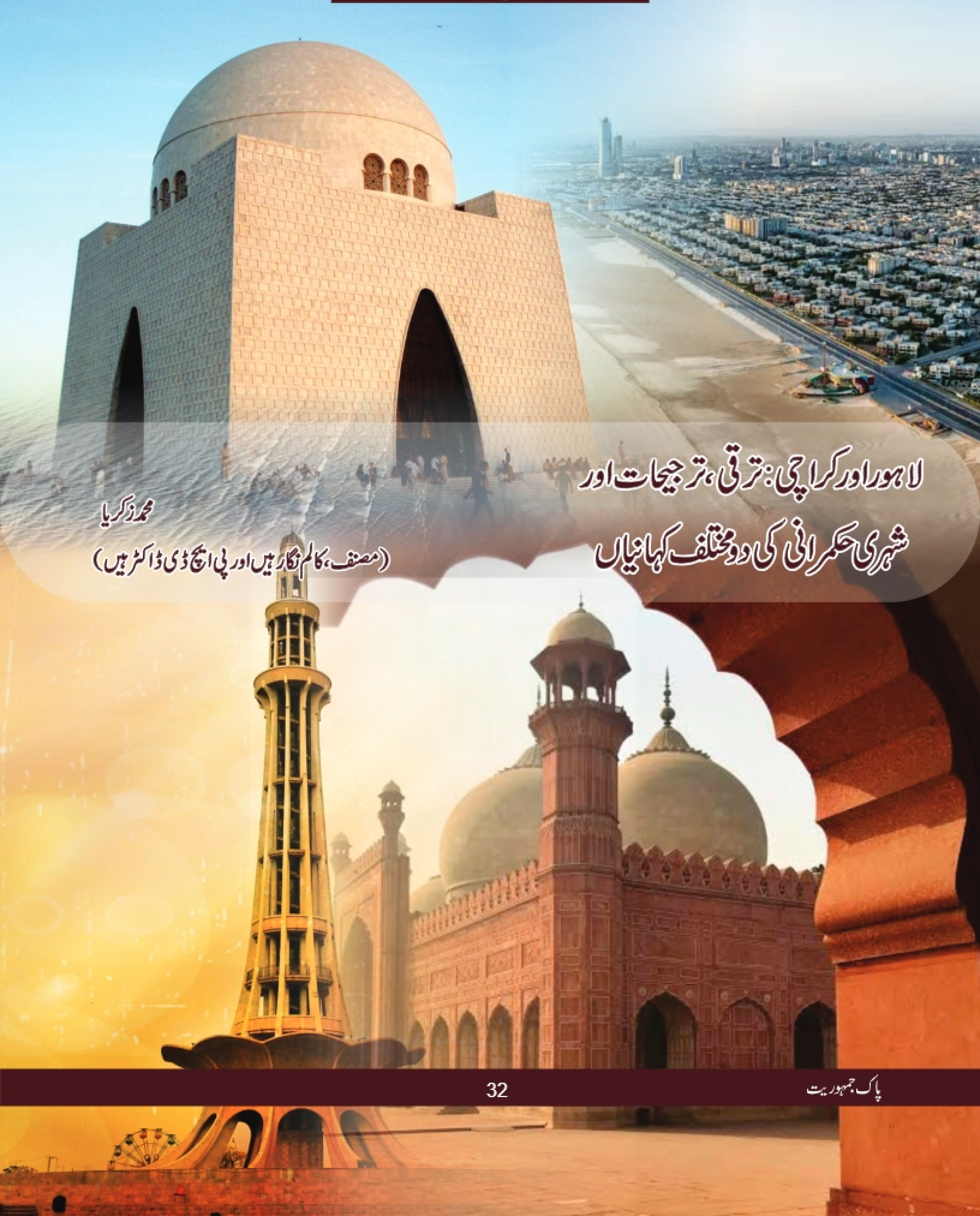

# لاہور اور کراچی: ترقی، ترجیحات اور شہری حکمرانی کی دو مختلف کہانیاں

محمد زکریا
(مصنف، کالم نگار ہیں اور پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں)

ایک ہی ملک کے دوشہر، دونوں کی الگ الگ کہانیاں، ایک کا دعویٰ ہے کہ وہ ٹیکس دیتا ہے تو وطن عزیز ترقی کرتا ہے جبکہ دوسرا پیرس سے ماڈرن ،بہترین انفراسٹرکچر اور دنیا کے خوبصورت ترین شہر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ دعویٰ دونوں کا سچ ہے ،دونوں سے پاکستان ہے اور درحقیقت دونوں ہی پاکستان ہیں۔ دودہائیوں قبل تک لاہور، کراچی کے مقابلہ کی تو دور کی بات، موازنہ بھی شجر ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ کراچی کا مقابلہ دنیا کے دیگر شہروں سے ہوتا تھا، روشنیوں کا شہر پورے پاکستان کی پہچان تھا اور سارے پاکستانیوں کی شان۔ لاہور، لاہور تھا اور لاہور ،لاہور ہی رہے گا، لاہور کے مزاج اور شناخت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ لاہور زندہ دلوں کا شہر ہے، کھابے ہوں یا موسیقی، میلے ہوں یا تہوار ،لاہوریوں کے انداز نرالے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کرنا انتہائی ضروری ہے کہ لاہور کو کراچی پر اور کراچی کو لاہور پر کوئی فوقیت نہیں، اور راقم بالکل غیر جانبدار رہتے ہوئے دونوں شہر کے عروج وزوال کی کہانی کا خلاصہ پیش کرنے کیلئے کوشاں ہے۔

پاکستان کی شہری تاریخ میں اگر دوشہروں نے سب سے زیادہ سیاسی، معاشی اور سماجی اہمیت حاصل کی ہے تو وہ کراچی اور لاہور ہیں۔ ایک ملک کا معاشی مرکز، سب سے بڑی بندرگاہ اور صنعتی سرگرمیوں کا محور ہے، جبکہ دوسرا سیاسی طاقت، ثقافتی شناخت اور انتظامی منصوبہ بندی کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ گزشتہ دودہائیوں کے دوران ان دونوں شہروں کی ترقی کا تقابلی جائزہ محض دوشہری مراکز کے درمیان موازنہ نہیں بلکہ پاکستان میں حکمرانی، وسائل کی تقسیم، مقامی حکومتوں کے کردار اور ترقیاتی ترجیحات کے بارے میں کئی بنیادی سوالات کو جنم دیتا ہے۔ آج جب کراچی اور

لاہور کا نام ایک ہی جملے میں لیا جاتا ہے تو اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ کیا لاہور واقعی کراچی سے آگے نکل چکا ہے؟ تاہم اس سوال کا جواب اتنا سادہ نہیں جتنا عمومی سیاسی بیانیے میں پیش کیا جاتا ہے۔

معاشی اعتبار سے دیکھا جائے تو کراچی آج بھی پاکستان کا سب سے اہم شہر ہے۔ ملک کی سب سے بڑی بندرگاہیں، مالیاتی ادارے، بینکنگ سیکٹر، اسٹاک مارکیٹ اور برآمدی صنعتوں کا بڑا حصہ کراچی میں موجود ہے۔ مختلف معاشی مطالعات اور سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کراچی قومی معیشت میں سب سے بڑا حصہ ڈالنے والا شہر ہے اور وفاقی محصولات میں اس کا کردار دیگر تمام شہری مراکز سے نمایاں ہے۔ مالی سال 2023-24 کے محصولات کے اعداد و شمار کے مطابق کراچی سے تقریباً 2.52 کھرب روپے سے زائد ٹیکس وصول کیا گیا، جبکہ لاہور تقریباً 1.40 کھرب روپے کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہا۔ یہ اعداد و شمار اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ قومی خزانے کو بھرنے میں کراچی کا کردار بدستور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کراچی سب سے زیادہ ٹیکس دہندہ ہے تو کراچی روشن و تابندہ کیوں نہیں؟ کراچی کا شمار دنیا کے ڈویلپ ترین شہروں میں کیوں نہیں ہوتا؟ کراچی میں امن کیوں نہیں اور سرمایہ کاری کیوں نہیں ہوتی؟ جب گفتگو شہری انفراسٹرکچر، ٹرانسپورٹ، نکاسی آب، سڑکوں، پارکوں اور شہری سہولتوں کی طرف بڑھتی ہے تو تصویر یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ کراچی کی روشنیاں ماند پڑ رہی ہیں، شہر قائد شکوہ کر رہا ہے، شکایتیں بھی کرتا ہے مگر مسلسل غفلت کے باعث اب تقریباً مایوس ہو چکا ہے۔

مہاجر اور مقامی کی سیاست، دیہی سندھ اور شہری سندھ کی تقسیم، ذہنی تنگ نظری اور لسانی اختلافات کراچی کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جو کراچی میں صاحبان اقتدار ہیں، ان سے اہلیان کراچی بے قرار ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ سب اچھا ہے اور یہ سب میڈیا کا فتور ہے، میری ذاتی رائے میں اسی ناقص سوچ کا سب سے بڑا قصور ہے۔ کراچی سب کا ہے، مگر کراچی کا کوئی نہیں، شہر کا مستقبل تو دور پرسان حال کوئی نہیں۔ ہر فرد کو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں نماز قضاء ادا کرنی ہے، جس نیت سے بیج بویا جا رہا ہے، اسی طرح کی فصل ملنی ہے۔

اگر بغور جائزہ لیا جائے تو لاہور نے بھی وہ ترقی نہیں کی جس کا لاہور حقدار ہے۔ اندرون لاہور آج بھی مسائل کی آماجگاہ ہے، سیوریج سمیت دیگر مسائل جوں کے توں موجود ہیں، یہاں قارئین کو اس بات سے بھی آگاہ کرنا ضروری ہے کہ لاہور کی جو بھی یا جتنی بھی ترقی ہے اس میں مقامی آبادی کی سوچ کا عمل دخل قابل تحسین ہے، اس ترقی میں سیاستدانوں سے زیادہ بیوروکریسی اور بیوروکریسی سے زیادہ عوام کا کردار ہے۔ لاہور کی خوش قسمتی ہے کہ گزشتہ دو دہائیوں میں جو بھی وزراء اعلیٰ منتخب ہوئے زیادہ تر کا تعلق لاہور سے تھا۔ لاہور کو پیرس بنانے کا خواب تھا، خواب شاید پورا تو نہیں ہوا، مگر تعبیر کا سفر ابھی جاری ہے اور یہی اس سفر کی خوبصورتی ہے۔ یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جنوبی پنجاب سمیت پنجاب کے دیگر اضلاع کے عوام یہ شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ حکومت کیلئے صرف لاہور ہی پنجاب ہے، صوبہ بھر کا بجٹ لاہور کی تعمیر و ترقی پر خرچ کیا جا رہا ہے جو کہ کافی حد تک معقول شکوہ ہے۔ اس شکایت میں شکریہ کا پہلو یہ ہے کہ حکومت کہیں تو بجٹ صرف کر رہی

ہے، کہیں تو توجہ دے رہی ہے۔

گزشتہ بیس برسوں میں لاہور نے جس رفتار سے انفراسٹرکچر کی ترقی دیکھی، اس کی مثال پاکستان کے کسی دوسرے بڑے شہر میں کم ہی ملتی ہے۔ رنگ روڈ، سگنل فری کوریڈورز، متعدد فلائی اوورز اور انڈر پاسز، میٹرو بس سسٹم اور اورنج لائن ٹرین جیسے منصوبوں نے لاہور کے شہری ڈھانچے کو نمایاں طور پر تبدیل کیا۔ اورنج لائن کے آغاز کے بعد لاہور پاکستان کا پہلا شہر بن گیا جہاں جدید شہری ٹرانزٹ نظام عملی طور پر کام کرتا نظر آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہارٹیکلچر، پارکوں کی تزئین، تاریخی عمارتوں کی بحالی، صحت اور تعلیم کے شعبوں میں سرمایہ کاری نے بھی لاہور کو ایک جدید شہری مرکز کے طور پر ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس کے برعکس کراچی گزشتہ کئی دہائیوں سے ایسے مسائل کا شکار رہا جنہوں نے اس کی ترقی کی رفتار کو متاثر کیا۔ سیاسی کشیدگی، لسانی تنازعات، امن وامان کے مسائل، بھتہ خوری، غیر منصوبہ بند شہری پھیلاؤ اور انتظامی پیچیدگیوں نے شہر کی ترقی کے عمل کو مسلسل متاثر کیا۔ اگرچہ 2013 کے بعد سیکیورٹی صورتحال میں نمایاں بہتری آئی اور معاشی سرگرمیوں میں استحکام پیدا ہوا، تاہم اس دوران بنیادی شہری ڈھانچے میں وہ سرمایہ کاری نہ ہو سکی جو شہر کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق ہوتی۔ نتیجتاً کراچی کو آج بھی پانی کی قلت، سیوریج کے مسائل، کچرے کے انتظام، پبلک ٹرانسپورٹ اور شہری منصوبہ بندی جیسے سنگین چیلنجز کا سامنا ہے۔

سندھ حکومت کی جانب سے بجٹ 27-2026 میں کراچی کی تعمیر و ترقی کیلئے 200 ارب روپے کا خطیر بجٹ مختص کیا گیا ہے، بجٹ مختص کرنے اور بجٹ کے درست استعمال میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اگر نیک نیتی سے 100 ارب روپے بھی کراچی پر خرچ کر دیے جائیں تو حالات میں مثبت تبدیلی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔ بجٹ کے استعمال میں سیاستدانوں، بیور کریٹس اور ٹھیکیداران کو کم از کم کراچی کے حالات پر رحم کھانے کی اشد ضرورت ہے۔

ماہرین شہریات کے نزدیک کراچی اور لاہور کے درمیان سب سے بڑا فرق وسائل سے زیادہ حکمرانی کے ماڈل میں پایا جاتا ہے۔ لاہور میں بیشتر شہری معاملات نسبتاً مربوط انداز میں صوبائی حکومت کے تحت چلائے گئے، جس کے باعث منصوبہ بندی اور عملدرآمد میں تسلسل برقرار رہا۔ دوسری جانب کراچی میں اختیارات مختلف اداروں، صوبائی حکومت، وفاقی ایجنسیوں اور بلدیاتی اداروں کے درمیان تقسیم رہے۔ اس تقسیم نے نہ صرف فیصلہ سازی کو پیچیدہ بنایا بلکہ متعدد ترقیاتی منصوبوں کو بھی تاخیر کا شکار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کے مسائل اکثر وسائل کی کمی سے زیادہ انتظامی ڈھانچے کی کمزوری سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کراچی کی موجودہ صورتحال کو سمجھنے کے لیے اس کی بلدیاتی تاریخ کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ برطانوی دور میں کراچی برصغیر کے بہترین بلدیاتی نظاموں میں شمار ہوتا تھا۔ مقامی سطح پر منتخب نمائندوں کو مالی اور انتظامی اختیارات حاصل تھے اور شہری منصوبہ بندی براہِ راست مقامی ضروریات کو مدنظر رکھ کر کی جاتی تھی۔ صاف پانی کی فراہمی، جدید ٹرانسپورٹ سروس، تعلیمی اداروں کا قیام، کشادہ سڑکیں اور مربوط ٹاؤن پلاننگ اسی دور کی یادگار ہیں۔ متعدد مورخین اور شہری منصوبہ ساز اس بات پر متفق ہیں کہ کراچی کی ابتدائی ترقی کا راز مضبوط مقامی حکومتوں اور مقامی سطح پر فیصلہ سازی کے مؤثر نظام میں پوشیدہ تھا۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد بلدیاتی اداروں کی مسلسل کمزوری، اختیارات کی مرکزیت اور مقامی حکومتوں کے غیر مستقل اور غیر فعال ڈھانچے نے اس نظام کو بتدریج کمزور کر دیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کراچی اور لاہور کو یکساں پیمانوں پر جانچنا ہمیشہ درست نتائج نہیں دیتا۔ کراچی آبادی، رقبے اور معاشی سرگرمیوں کے اعتبار سے لاہور سے کہیں بڑا اور زیادہ پیچیدہ شہر ہے۔ دو کروڑ سے زائد آبادی والے شہر کو پانی، ٹرانسپورٹ، صفائی اور رہائش جیسی بنیادی سہولتیں فراہم کرنا بذاتِ خود ایک بڑا انتظامی چیلنج ہے۔ دوسری طرف لاہور کو بھی فضائی آلودگی، ٹریفک کے دباؤ، زیرزمین پانی کی تیزی سے گرتی سطح اور بے ہنگم شہری توسیع جیسے مسائل کا سامنا ہے، لیکن مجموعی طور پر شہری خدمات کی فراہمی میں لاہور کی کارکردگی نسبتاً بہتر سمجھی جاتی ہے۔

اسی تناظر میں یہ بحث بھی سامنے آتی ہے کہ آیا لاہور کی ترقی وسائل کی غیر متوازن تقسیم کا نتیجہ تھی یا بہتر انتظامی حکمت عملی کا۔ ناقدین کا مؤقف ہے کہ مختلف ادوار میں لاہور کو خصوصی توجہ دی گئی اور ترقیاتی فنڈز کا بڑا حصہ اسی شہر پر خرچ کیا گیا۔ اس کے برعکس حامیوں کا استدلال ہے کہ ترقیاتی منصوبوں کی کامیابی کا راز صرف وسائل نہیں بلکہ مؤثر عملدرآمد، نگرانی اور پالیسی کے تسلسل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ حقیقت غالباً ان

دونوں دعوؤں کے درمیان موجود ہے، جہاں وسائل اور انتظامی صلاحیت دونوں نے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔اس تجزیے کا ایک اور پہلو سیاسی ترجیحات ہیں۔لاہور پاکستان کی قومی سیاست میں ہمیشہ مرکزی حیثیت رکھتا رہا ہے۔متعدد وزرائے اعظم اور اعلیٰ سیاسی قیادت کا تعلق لاہور یا پنجاب سے رہا،جس کے باعث بعض حلقے یہ سمجھتے ہیں کہ لاہور کو ترقیاتی منصوبوں میں اضافی اہمیت دی گئی۔دوسری جانب کراچی کو اکثر صوبائی اور وفاقی سیاست کے درمیان اختیارات کی کشمکش کا سامنا رہا۔اس سیاسی عدم ہم آہنگی نے بھی ترقیاتی رفتار کو متاثر کیا۔

کراچی نے جو تیز رفتار ترقی کی اس کی مثال شائد ہی دنیا کے کسی دوسرے شہر کی ملتی ہو۔ یہ ساری ترقی قیام پاکستان سے قبل کا قصہ ہے، جب ہندو، مسلم، پارسی اور عیسائی اس شہر کی ترقی اور خوبصورتی کے لیے یک سو تھے۔مشترکہ طور پر اپنے شہر کی دیکھ بھال کے لیے نمائندے منتخب کرتے۔انہی منتخب لوگوں نے بغیر کسی بیرونی امداد کے بلدیہ کراچی کی عظیم الشان عمارت سمیت بے شمار یادگاریں تعمیر کیں، جن پر آج بھی اہل کراچی آثار قدیمہ کے طور پر فخر کرتے ہیں۔کراچی کی آج جو حالت ہے، یہ ایک دن میں نہیں ہوئی ہے۔دہائیوں کی جدوجہد کے بعد کراچی اس حالت کو پہنچا ہے۔آج کراچی اور لاہور کا موازنہ کیا جائے تو لاہور بہتر نظر آتا ہے۔آج کراچی رہنے کے قابل نہیں رہا۔ایک وقت تھا لاہور میں بھی نشیبی علاقے بارشی پانی میں ڈوب جاتے تھے لیکن آج کراچی سے خاصا بہتر ہے جس طرح کراچی کی یہ بربادی ایک دن میں نہیں ہوئی ہے۔اسی طرح لاہور کی بہتری بھی ایک دن میں نہیں ہوئی ہے۔برسوں لگے ہیں۔بجلی کی لوڈشیڈنگ یا بندش نے کراچی کی معاشی کمر توڑ دی

لیکن بجلی کی ترسیل کا نظام بھی ایک دن میں اس نہج پر نہیں پہنچا بلکہ سالہا سال کی جان توڑ محنت سے کراچی میں بجلی کی ترسیل کے نظام کو اس صورتحال تک پہنچایا گیا ہے۔

عوام بنیادی مسائل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بلدیاتی اداروں کی کمزوری، اس کی واحد وجہ ہے۔ جمہوری اداروں کی پوری طرح نشو و نما نہ ہونا صرف سیاسی حکومتوں کا وقفے وقفے سے توڑنا اور مارشل لاؤں کا نفاذ ہی نہیں، خود سیاسی جماعتوں میں عدم جمہوریت، مقامی بلدیاتی اداروں کے ساتھ مارشل لاؤں جیسا سلوک کرنے سے جمہوریت کمزور اور ترقی کا سفر رکا ہوا ہے۔ ہر آمر نے مقامی حکومتوں میں علیحدہ علیحدہ ماڈل کے ساتھ بنیادی جمہوریت بحال کی لیکن ان کے بعد اقتدار میں آنے والی ہر سیاسی پارٹی نے ان اداروں کے ساتھ سخت رویہ اور ناروا سلوک روا رکھا۔ جیسے یہ ادارے مارشل لاء کے نفاذ کے ذمہ دار ہوں۔ جمہوری دور میں بلدیاتی اداروں کو توڑ کر بیوروکریسی کے حوالے کرنے سے نہ صرف بلدیاتی اداروں اور بنیادی جمہوریت کا ارتقاء مجروح ہوتا رہا بلکہ نرسری میں وہ پنیری ہی تیار نہ ہو سکی جس سے جمہوریت کا پھل ملنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جمہوری معاشروں میں سب سے زیادہ توجہ حاصل کرنے والی مقامی حکومتوں پر پاکستان کی جمہوری حکومتوں نے نہ صرف اہمیت ہی نہیں دی، بلکہ اس پر تہہ و تیغ سے حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔

کشتہ تیغ ستم، بلدیہ کراچی ہمیشہ ان ستم گروں کے نشانہ پر ہی رہی جو جمہویت کا نعرہ لگا کر اسمبلیوں میں آتے رہے۔ قانون سازی اور طاقت کے اختیار کو استعمال کر کے جمہوریت کی نرسریوں کو کچلتے رہے۔ سیاسی جماعتیں اور سیاست دان شائد سمجھتے ہیں کہ بلدیاتی اداروں کا اختیار بنیادی سطح کے منتخب نمائندوں کے پاس ہوگا تو ان کا کنٹرول کم ہو جائے گا۔ ان اداروں کے ساتھ سیاسی لیڈروں کے مفادات وابستہ ہیں، لہذا وہ کارکنوں کے حوالے کر کے ان کی مداخلت اور اپنا کنٹرول کم کرنے پر تیار نہیں، یہی وجہ ہے کہ جمہوری دور میں نہ بلدیاتی انتخابات ہوتے ہیں اور نہ بلدیاتی نظام مضبوط کیا جاتا ہے، بلکہ ان اداروں کو گزشتہ 13 سال کے دوران ایسے توڑا کہ اب نہ ان کی افادیت باقی رہی نہ اہمیت۔ کراچی پر اس کے گہرے اثرات پڑے اور اس کی لوکل گورنمنٹ کو مفلوج بنا دیا گیا۔ 2 کروڑ سے زائد آبادی کے شہر میں کوئی بلدیاتی نظام ہی نہیں جو اس شہر کا پانی، سیوریج، بجلی صفائی، اسٹریٹ لائٹ گلیوں سڑکوں کو پختہ کرنے سمیت بنیادی شہری مسائل حل کرنے کا ذمہ دار ہو۔

حکومت کوشش کر رہی ہے چاہے وہ وفاقی ہو یا صوبائی کہ کچھ مسائل حل ہوں مگر طے شدہ اصولوں اور نظام کے بغیر کامیابی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ کراچی میں کمزور انفرا اسٹرکچر، امن و امان کی خراب صورتِ حال، مہنگی زمین اور پانی صنعتی ترقی میں بڑی رکاوٹ ہیں، اسی لیے صنعت کار اب کراچی کے بجائے ملک کے دیگر شہروں میں صنعتیں لگانے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ کراچی میں 7 بڑے صنعتی زون ہیں، مگر کسی ایک میں بھی صنعتی انفرا اسٹرکچر اچھا نہیں ہے، صنعت کاروں کو نہ صرف آنے جانے میں مشکلات ہوتی ہیں بلکہ وہ غیر ملکی خریداروں کو دورہ بھی نہیں کروا سکتے۔ کراچی میں زمین کم از کم 6 کروڑ روپے ایکڑ ہے جبکہ پنجاب میں اس کی قیمت 3 کروڑ روپے فی ایکڑ ہے۔ کراچی میں مہنگی

یوٹیلٹی اور خراب انفرا اسٹرکچر کے باعث 30 فیصد تک صنعتیں بند ہیں، جبکہ متعدد پنجاب منتقل ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صنعتی علاقوں میں امن و امان کی صورتِ حال بھی اچھی نہیں ہے اور صنعت کاروں کو آج بھی بھتے کی پرچی مل رہی ہے۔

شہباز شریف دس سال مسلسل وزیر اعلیٰ پنجاب رہے ہیں۔ ان کی لاہور کے نشیبی علاقوں میں بارشی پانی میں لانگ بوٹ پہنے کھڑے تصویر پر طنزیہ جملے بھی بہت مقبول ہوئے لیکن سچ یہ ہے کہ انھوں نے لاہور کے نشیبی علاقوں میں نکاسی آب کے لیے بہت کام کیا ہے۔ جب بھی شدید بارش ہوتی، وہ ساری ڈسٹرک ایڈمنسٹریشن، لاہور کے صوبائی وزراء اور ایم پیز کو لے کر بارش کے دوران ہی لانگ بوٹ پہن کر شہر کے نشیبی علاقے میں پانی میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ اب لاہور میں ایسا کوئی علاقہ نہیں جہاں کئی کئی گھنٹوں پانی کھڑا رہتا ہو۔ لاہور میں نکاسی کا نظام اس قدر فعال ہو گیا ہے کہ اب شدید بارش کے بعد اکثر علاقوں میں ایک یا دو گھنٹے کے اندر پانی نکل جاتا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ وفاقی حکومت نے بھی کراچی کے ساتھ سوتیلی اولاد جیسا سلوک کیا ہے۔ ہر وقت کراچی کو وفاقی حکومت کی جانب سے خصوصی پیکیج دیے جانے کی بات کی جاتی ہے لیکن کوئی خصوصی پیکیج نہیں ملا ہے۔ لیکن کیا کراچی کی اس صورتحال کی تمام تر ذمے داری وفاقی حکومت سے خصوصی پیکیج نہ ملنے کو قرار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔

آپ لاہور کو ہی دیکھ لیں لاہور کو وفاق سے کبھی کوئی خصوصی پیکیج نہیں ملا ہے۔ پنجاب حکومت نے اپنے وسائل سے لاہور کو ترقی دی ہے۔ پنجاب میں میٹروز بنی ہیں۔ لیکن وفاق سے کوئی گرانٹ پیکیج نہیں لی گئی۔ لاہور میں گندے نالوں کی صفائی کے لیے وفاق سے کوئی گرانٹ نہیں لی گئی تو کراچی کے گندے نالوں کی صفائی کے لیے وفاقی حکومت سے گرانٹ کی کیوں ضرورت ہے۔ پنجاب اور لاہور اس حوالے سے خوش قسمت رہے ہیں کہ ن لیگ کی پنجاب اور وفاق دونوں جگہ حکومت رہی ہے۔ اس وجہ سے لاہور کی ترقی ممکن ہوئی ہے۔ لیکن ایسا صرف کچھ سال کے لیے ہوا ہے جب کہ سندھ کو بھی ایسے پانچ سال ملے ہیں جب سندھ اور وفاق دونوں جگہ پیپلز پارٹی کی حکومت رہی ہے۔

تمام تر بحث کے باوجود ایک حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ پاکستان کی معاشی اور شہری ترقی کا مستقبل کراچی اور لاہور دونوں سے وابستہ ہے۔ کراچی ملکی معیشت کا سب سے بڑا محرک ہے جبکہ لاہور شہری منصوبہ بندی اور انفرا اسٹرکچر کی ترقی کا ایک نمایاں ماڈل بن چکا ہے۔ چنانچہ اصل سوال یہ نہیں کہ کون سا شہر دوسرے سے بہتر ہے، بلکہ سوال یہ ہے کہ پاکستان ان دونوں شہروں کے تجربات سے کیا سیکھ سکتا ہے اور کس طرح ایسی شہری پالیسی تشکیل دے سکتا ہے جو معاشی قوت اور شہری معیارِ زندگی دونوں کو یکساں اہمیت دے۔

# مصنوعی ذہانت کی معیشت

# چوتھا صنعتی انقلاب

رباب زہرا

(مصنفہ ملکی اور بین الاقوامی امن اور احترام انسانیت کے حوالے سے مختلف اخبارات اور رسائل کے لیے لکھتی ہیں)

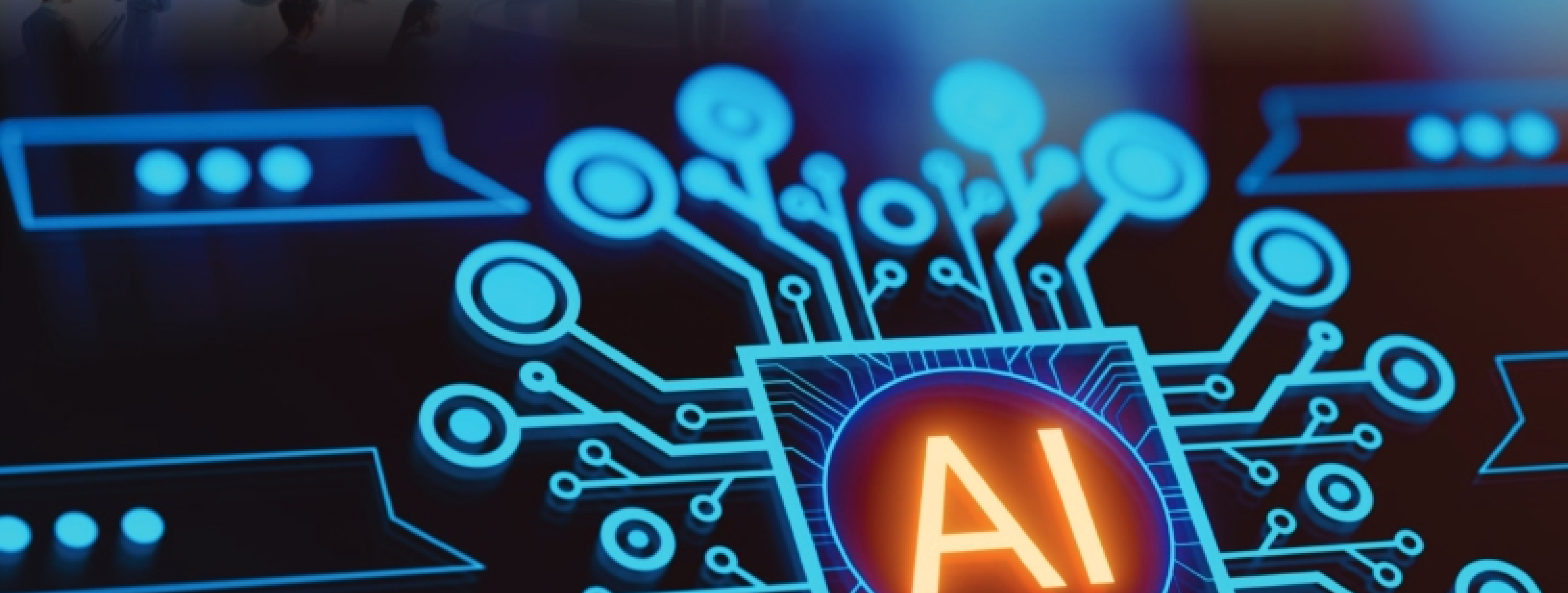

تعلیم وتحقیق سے دنیا بھر میں نت نئ ایجادات سے انسان اور انسانیت کی سہولت کاری کے لیے مواقع ڈھونڈے جارہے ہیں اور یقیناً یہ مسلسل تحقیق وتعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں میں پوری دنیا میں تحقیقی ایجادات نے دھوم مچائی، وہ کچھ دکھائی دیا جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں گیا تھا۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں کمپیوٹرز، موبائل اور لیپ ٹاپ نے تعلیم وتربیت اور کاروباری معاملات کو یکسر بدل دیا۔ آئی۔ ٹی نے بھی نئ نسل کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا، سائبر محاذ بھی انتہائی اہم ثابت ہوا، ٹیکنالوجی نے ترقی کی، تعلیمی انداز اور لوگوں کی سوچ بدلی۔ عام طور پر جیسے جیسے ترقی ہوتی ہے ویسے ویسے معاملاتِ زندگی میں آسانیاں ہی نہیں، آلاتِ ضرورت کی قیمتوں میں بھی کمی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن جدید دور میں اے۔ آئی متعارف ہوئی تو اس نے پوری دنیا کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ مصنوعی ذہانت معیشت پر بھی حملہ آور ہے۔ نئ نسل کے اے۔ آئی ماڈلز ماضی سے مختلف اور طاقتور ہی نہیں، ان کی تیاری، تربیت اور استعمال کی لاگت بھی روز بروز کم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھ رہی ہے۔

موجودہ صورتحال پاکستان جیسے ممالک کے لیے ایک موقع اور چیلنج ہے۔ اگر ترقی پذیر ممالک پاکستان سمیت بروقت تحقیق اور انسانی وسائل میں سرمایہ کاری کر کے ڈیٹا سینٹرز اور ڈیجیٹل انفراسٹرکچر بنالیں تو اے۔ آئی معاشی ترقی کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہے، ورنہ ہم دیگر

شعبوں کی طرح محض صارف بن کر رہ جائیں گے اور اس منافع بخش، تہلکہ برپا کرنے والی اے۔آئی سے بھی نہ صرف ترقی پذیر ممالک فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے بلکہ اس پر بڑی ٹیکنالوجی کمپنیاں قبضہ کر کے اجارہ داری قائم کر لیں گی۔ موجودہ حالات مستقبل کی نوید سنا رہے ہیں کہ آنے والا زمانہ اے۔آئی کا ہے۔ جو نہیں چل سکے گا وہ پیچھے ہی نہیں، ناکامی اور مایوسی کی دلدل میں پھنس جائے گا کیونکہ اسے چوتھے صنعتی انقلاب کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جوں جوں اس کا استعمال بڑھ رہا ہے توں توں جدید اے۔آئی سستی ہونے کے بجائے مہنگی ترین ہوتی جا رہی ہے۔ آخر کیوں؟

اس صورتحال کا جائزہ لیں تو یہ بات بآسانی پتہ چل جائے گی کہ اے۔آئی کی لاگت میں سب سے بڑی وجہ "کمپیوٹنگ پاور" ہے جبکہ جدید ماڈلز کی تربیت، لاکھوں گرافکس پروسیسنگ یونٹس اور بھاری ڈیٹا درکار ہوتا ہے جس کے لیے صرف ماڈلز کی تربیت پر کروڑوں ڈالر خرچ نہیں ہوتے بلکہ اس کی تیاری، اپ ڈیٹ کر کے چلانے اور اربوں سوالات کے جوابات کے لیے بھاری بھرکم ڈیٹا سینٹرز اور توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میدان میں موجود کمپنیاں ایک دوسرے پر فتح اور برتری حاصل کرنے کے لیے نہ صرف خطیر سرمایہ کاری کر رہی ہیں بلکہ درست نتائج، بہتر ماڈلز اور نئے تجربات کے لیے بے دریغ سرمایہ خرچ کر کے مدِمقابل کے لیے چیلنج بن چکی ہیں۔

ایسے میں مؤثر مقابلے کے لیے آنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے کیونکہ بڑھتی ہوئی لاگت اور سخت مقابلہ مستقبل کی خواہشوں کی راہ میں رکاوٹ دکھائی دے رہے ہیں۔ ہر ترقی اور نئے رجحانات میں فارمولا نفع ونقصان اور جمع تفریق کا ہی استعمال ہوتا ہے کیونکہ ہر سرمایہ دار اور تاجر ضرب، جمع اور تقسیم کے بغیر سرمایہ کاری کرنے سے گریز کرتا ہے۔ دنیا کی بڑی کمپنیوں نے آغاز ہی میں اس قدر سرمایہ کاری کر دی کہ اب نئے آنے والے مہنگائی اور بڑی سرمایہ کاری سے خوفزدہ ہیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ جدید اے۔آئی نے تعلیم، صحت، صنعت، زراعت اور کاروباری سرگرمیوں میں غیر معمولی کارنامے بھی دکھا دیے ہیں۔ بیماریوں کی تشخیص، طلبہ کی تعلیم، کاروباری فیصلوں میں بہتری اور پیداوار میں اضافہ ہی نہیں بلکہ ملازمتوں کے مواقع بھی وافر پیدا کیے جا رہے ہیں۔ پھر بھی ایک اہم شعبہ توانائی کا ہے۔ ماڈلز کو چلانے کے لیے بجلی درکار ہے۔ عالمی سطح پر ڈیٹا سینٹرز کی توانائی کھپت میں نہ صرف اضافہ ہو رہا ہے بلکہ اس کے ماحولیاتی اثرات بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ ان حالات میں اگر توانائی کے پائیدار ذرائع میسر نہ آئے تو اے۔آئی کی ترقی نئے ماحولیاتی چیلنجز پیدا کر دے گی۔

موجودہ اے۔آئی میں سب سے بڑا چیلنج اور نقصان یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی لاگت اسے چند کمپنیوں کی اجارہ داری اور قبضے میں تبدیل کر رہی ہے۔ اندازہ لگائیں کہ اگر ڈیٹا، تحقیق اور کمپیوٹنگ وسائل صرف گنتی کی کمپنیوں تک محدود ہوں گے تو ایسی اجارہ داری قائم ہو سکتی ہے کہ ترقی پذیر ممالک کی پہنچ سے سب کچھ دور ہو جائے۔ خدشات، تحفظات اور امکانات موجود ہیں۔ اب دنیا چند سالوں میں اے۔آئی کے میدان میں

کیسے آگے بڑھتی ہے، یہی اقدام سب سے اہم ہے کیونکہ مصنوعی ذہانت صرف "ٹیکنیکی انقلاب" نہیں، ایک "صنعتی انقلاب" بھی ہے۔ لیکن اس کی بڑھتی ہوئی لاگت اس بات کی دلیل ہے کہ مستقبل کی معیشت میں طاقت کا مرکز صرف سرمایہ ہرگز نہیں ہوگا بلکہ مقدر کا سکندر وہ ہوگا جس کے پاس ڈیٹا، کمپیوٹنگ صلاحیتیں اور عملی تحقیق برتری ہوگی۔ اس لیے پاکستان سمیت دنیا بھر کو اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے مشترکہ حکمت عملی ترتیب دینی ہوگی جس سے اے۔ آئی کے فوائد سب کو حاصل ہو سکیں اور اس کے سماجی و معاشی نقصانات کو بھی محدود کیا جا سکے۔

اگر کسی انفرادی یا اجتماعی غلطی سے ایسا نہیں کیا جا سکا تو مصنوعی ذہانت عدم مساوات کا بحران دنیا بھر میں پیدا کر سکتی ہے۔ دورِ حاضر میں مصنوعی ذہانت نے بہت سے شعبوں میں انقلاب برپا کر کے حضرتِ انسان کو مشکل میں ڈال دیا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی نظر نہیں چرائی جا سکتی کہ افادیت کے ساتھ غلط استعمال سے منفی نتائج بھی رونما ہو رہے ہیں اور یہ امکانات بھی مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں۔

اے۔ آئی کی بھاری بھرکم لاگت نے انسانی محنت اور وقت میں کمی کی سہولت کاری کی ہے۔ دنیا میں اب ایسی کمپنیاں موجود ہیں جو گھنٹوں، دنوں اور مہینوں کا کام منٹوں میں انجام دے رہی ہیں، لیکن اس کا تاریک پہلو بھی موجود ہے کہ جعلی تصاویر، ویڈیوز، فیک نیوز، سائبر حملے، خودکار ہتھیاروں اور جنگی حکمت عملی میں اے۔ آئی کا کردار جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اسی لیے اس کی سنگینی میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے

کیونکہ اگر فیصلہ انسانی ذہن کی بجائے مصنوعی ذہانت سے ہوگا تو مسائل گمبھیر ہو سکتے ہیں۔

حالیہ ایران-اسرائیل-امریکہ جنگ میں دنیا پہلی مرتبہ اے۔آئی کی بڑے پیمانے پر کارروائی دیکھ چکی ہے۔اسرائیل نے اے۔آئی کی مدد سے ایرانی خفیہ معلومات حاصل کر کے ممکنہ اہداف کو نشانہ بنایا، ایران بھی جو کر سکتا تھا اس نے کر دکھایا۔ یوکرائن جنگ میں بھی دونوں ممالک نے ڈرونز، میزائل اور دفاعی نظاموں میں اے۔آئی کا استعمال کیا۔لہٰذا لمحہ فکریہ ہے کہ اگر مستقبل میں مشینیں انسانوں سے زیادہ تیزی سے فیصلے کرنے لگیں تو پھر ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟

سوچ صرف اس نقطے پر رکتی نہیں بلکہ سوال پر سوال کرتی ہے کہ اے۔آئی جس انداز میں مہنگی سے مہنگی ترین ہوتی جا رہی ہے، اس سے تو دنیا جلد چند امیر ترین لوگوں کی غلامی میں جکڑی جائے گی اور اس کی اجارہ داری انسان اور انسانیت کے استحصال کا باعث ہی نہیں بلکہ زندگی اور کاروبارِ حیات کے ہر شعبے کی ٹھیکیدار بن جائے گی۔

یہ حقیقت ہے کہ جدید اے۔آئی کی کامیابیوں اور اسے فعال بنانے کے لیے بجلی و توانائی کی طلب بھی کئی گنا بڑھ جائے گی اور سرمایہ کار کھربوں کی سرمایہ کاری سے ایسی فتوحات حاصل کرے گا کہ اسے "ڈیجیٹل کرنسی" کی حیثیت ملے۔ یہ صرف سافٹ ویئر نہیں بلکہ ایک ایسا مکمل

معاشی نظام بن کر ابھرے گا کہ اس کے ڈیٹا، توانائی، چپس اور کمپیوٹنگ طاقت کا متبادل نہیں ملے گا۔ دورِ حاضر میں اس کی نشانیاں واضح نظر آ رہی ہیں۔

لیکن اسی تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ کریں تو یہ راز بھی کھل جائے گا کہ اگر اس قدر اہم ترین اے۔آئی ٹیکنالوجی کو کسی طرح دنیا نے سستی کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئی تو کیا یہ اہم ترین طاقت انسان اور انسانیت کے کام آئے گی؟ کیا ہر شخص اتنا ہی ذمہ دار ثابت ہوگا جتنا اسے ہونا چاہیے؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا کیونکہ مصنوعی ذہانت اب انسانی طاقتور ٹیکنالوجی کی وہ حقیقت ہے جو ترقی، خوشحالی اور جدت کی نئی منازل کے ساتھ پستی کی دلدل میں بھی دھکیل سکتی ہے۔

کیونکہ ہر نئی ایجاد مثبت ارادوں سے ہوتی ہے لیکن اس کے منفی اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اے۔آئی زمانہ جنگ اور امن، معاشی بحران اور ترقی و خوشحالی کے دور میں "عدم مساوات" پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس صورتحال میں اے۔آئی مہنگی ترین ہو یا سستی ترین، بہترین ہو یا بدترین سوال صرف ایک ہی ہوگا کہ دنیا کی کون سی قوم اور ممالک اس کی حقیقی طاقت کو زیادہ ذمہ داری اور عقلمندی سے استعمال کر رہے ہیں۔ پھر بھی اس نعرے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اے۔آئی "چوتھا صنعتی انقلاب" نہیں، حقیقت یہی ہے کہ مصنوعی ذہانت کی معیشت ہی اب انسانوں کا مستقبل ہے اور جدیدیت کی خواہش کے ساتھ اخراجات میں مزید اضافے کے امکانات کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

# ہماری مطبوعات

| نمبر شمار | مطبوعات | زبان | قیمت پاکستانی روپے | قیمت امریکی ڈالر |
|---|---|---|---|---|
| 1 | قائداعظم محمد علی جناح خطبات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (مجلد) | انگریزی | 150/- | $-05 |
| 2 | قائداعظم محمد علی جناح خطبات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (پیپر بیک) | انگریزی | 150/- | $-05 |
| 3 | قائداعظم محمد علی جناح خطبات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (پیپر بیک) | اردو | 350/- | $-17 |
| 4 | قائداعظم محمد علی جناح (تصویری البم) 1876ء تا 1948ء (مجلد) | انگریزی | 350/- | $-17 |
| 5 | قائداعظم محمد علی جناح (تصویری البم) 1876ء تا 1948ء (پیپر بیک) | انگریزی | 350/- | $-17 |
| 6 | قائداعظم کے شہری اقوال | انگریزی | 100/- | $-04 |
| 7 | اقوالِ قائد (پیپر بیک) | انگریزی | 50/- | $-03 |
| 8 | قائداعظم کے بانی محمد علی جناح | انگریزی | 400/- | $-15 |
| 9 | [illegible] | انگریزی | 250/- | $-10 |
| 10 | مادرِ ملت سرمایات | اردو | 250/- | $-10 |
| 11 | مادرِ ملت تصویری البم | اردو | 250/- | $-10 |
| 12 | پاکستان ہینڈی کرافٹس | انگریزی | 200/- | $-04 |
| 13 | پاکستان کرونولوجی 1947ء تا 2006ء (چار جلدیں) | انگریزی | 450/- | $-17 |
| 14 | پاکستان کرونولوجی 1947ء تا 2006ء (پیپر بیک) (چار جلدیں) | انگریزی | 400/- | $-15 |
| 15 | پاکستان مناظر | انگریزی | 250/- | |
| 16 | پاکستان۔ ابتدائی حقائق | انگریزی | 50/- | $-02 |
| 17 | آئیے پاکستان ایک طائرانہ نظر | انگریزی | 2000/- | $-120 |
| 18 | [illegible] | انگریزی | 1000/- | $-20 |
| 19 | [illegible] | انگریزی۔ عربی۔ فرانسیسی۔ چینی | 500/- | $-20 |
| 20 | [illegible] | انگریزی | 2500/- | $-125 |
| 21 | [illegible] | انگریزی | 60/- | |
| 22 | [illegible] | انگریزی | 200/- | $-12 |
| 23 | ٹرک آرٹ | انگریزی | 200/- | $-08 |
| 24 | کنٹمپریری آرٹ اِن پاکستان ([illegible]) | انگریزی | 100/- | $-04 |
| 25 | مسلم آرٹ اینڈ ہیریٹیج آف پاکستان ([illegible]) | انگریزی | 100/- | $-04 |
| 26 | اسلامی معاشرتی اقدار | اردو | 15/- | $-01 |
| 27 | دستِ افکار (علاقائی شاعری سے انتخاب) | اردو | 100/- | $-04 |
| 28 | رحمت کا خورشید (عبدالستار ایدھی) | انگریزی | 615/- | $-50 |
| 29 | ماہِ نو غالب (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 500/- | $-60 |
| 30 | ماہِ نو اقبال (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 350/- | $-17 |
| 31 | ماہِ نو قائداعظم (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 500/- | $-60 |
| 32 | ماہِ نو [illegible] (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 500/- | $-60 |
| 33 | ماہِ نو [illegible] (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 500/- | $-60 |
| 34 | ماہِ نو احمد ندیم قاسمی (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 400/- | $-60 |
| 35 | ماہِ نو جالب نمبر (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 500/- | $-60 |
| 36 | ماہِ نو جوش (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 400/- | $-60 |
| 37 | ماہِ نو انتخاب نظم (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 400/- | $-60 |
| 38 | ماہِ نو انتخاب 2018ء (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 400/- | $-60 |
| 39 | ماہِ نو سرسید احمد خان (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 400/- | $-15 |
| 40 | ماہِ نو [illegible] (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 400/- | $-60 |
| 41 | ماہِ نو (ماہنامہ) (گزشتہ شمارے) | اردو | 100/- فی شمارہ | |
| 42 | ماہِ نو (ماہنامہ) (آن لائن) | اردو | | |
| 43 | پاک جمہوریت ([illegible]) (خصوصی ایڈیشن) | اردو | 10/- | |
| 44 | پاک جمہوریت (ماہنامہ) (گزشتہ شمارے) | اردو | 100/- فی شمارہ | |
| 45 | پاک جمہوریت (ماہنامہ) (آن لائن) | اردو | | |
| 46 | پاکستان پکٹوریل | انگریزی | 200/- | $-120 |

رابطہ برائے خریداری

منیجر: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز، پی۔ ایف بلڈنگ، زیرو پوائنٹ، اسلام آباد، پاکستان۔ فون: 051-9252182 فیکس: 051-9252176

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز، اسلام آباد
ریجنل آفس: 291اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور۔